# ماہنامہ ترجمان القرآن

بجاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

جلد ۱۱۹ جولائی ۱۹۹۱ء عدد ۸

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

جاری کردہ :

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ **ترجمان القرآن** لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل: ۵۳۴۰

جلد ۱۱۵ جولائی ۱۹۹۱ء - محرّم الحرام ۱۴۱۲ھ عدد ۵



رابطہ و ترسیلِ زر کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ - رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۶۸۶۳۶ - ۳۲۴۴۶۸ پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

فی پرچہ: ۶ روپے زرِ سالانہ: ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودُودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# اشارات

اگست ۱۹۹۱ میں جماعتِ اسلامی کے قیام کے پچاس سال پورے ہو جائیں گے، اگرچہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس سے بھی تقریباً ۱۵ سال قبل جماعتِ اسلامی کے نصب العین اور قیام کی دعوت کے کام کا آغاز کر دیا تھا۔ مرکزی مجلسِ شوریٰ نے یہ طے کیا ہے کہ پچاسویں سال کے موقع کی مناسبت سے جماعتِ اسلامی کی دعوت زیادہ زور شور سے پیش کرنے، عوام میں اسے وسیع پیمانے پر روشناس کرانے، اور خود جماعت میں نئے ولولہ اور یکسوئی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھنے کا عزم بیدار کرنے کے لیے خصوصی تقریبات کا اہتمام کیا جائے۔

ہم گزشتہ پچاس سالوں میں کن کن مراحل سے گزرے، کیا کیا رکاوٹیں راستے میں پیش آئیں، ہم نے کیا کیا پیش قدمیاں کیں، یہ ایک طویل داستان ہے۔ اس داستان کی تاریخ بعض احباب نے لکھی ہے، اور کچھ لکھی جا رہی ہے۔ میں اس وقت، مجلسِ شوریٰ کے فیصلہ کے تحت منعقد کی جانے والی پچاس سالہ تقریبات کے موقع کی مناسبت سے، ماضی و حال کی روشنی میں، یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ہم آج کس مرحلہ میں ہیں، ہمیں کیا چیلنج درپیش ہیں، ہم ان کا مقابلہ کس طرح کر رہے ہیں، اور آئندہ ہمیں کیا کچھ کرنا ہے۔

---

آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے تقریباً سارا عالمِ اسلام مغربی تہذیب اور مغربی سامراج کے تسلّط میں تھا۔ اس کا اکثر حصّہ، برِصغیر سمیت، براہِ راست برطانیہ کی مضبوط گرفت میں تھا۔ اسلام کا نام بھی تھا، مذہبی مراسم بھی ادا کیے جاتے تھے، دینی دعوت و تعلیم بھی جاری تھی، لیکن دین

کے اس تصوّر کا شعور خال خال لوگوں میں پایا جاتا تھا کہ اس کا قیام ہی ہر مسلمان کا انفرادی طور پر، اور امتِ مسلمہ کا بحیثیت مجموعی، مقصدِ حیات ہے۔ بحیثیت ایک جامع نظامِ زندگی کے بھی دین کا تصوّر اکثر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ دین کے قیام کے لیے جدّوجہد میں زندگی کے آثار بھی مفقود تھے۔ ان حالات میں پورا عالمِ اسلام مایوسی اور افسردگی کا شکار تھا۔

برّصغیر کے مسلمان، آٹھ سو سال حکومت کرکے، انگریز کی غلامی میں جا چکے تھے۔ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ، خلافت تحریک کی ناکامی، ہندو سامراج کی ریشہ دوانیاں، پہلے انتخابات کے نتیجہ میں قائم ہونے والی اکثریتی ہندو حکومتوں کے مظالم--- ان سب عوامل کے نتیجہ میں برّصغیر کے مسلمانوں پر مایوسی اور افسردگی کے زیادہ ہی گہرے سائے چھائے ہوئے تھے۔

مایوسی کے اس عالم میں کچھ علماء ضرور مسلمانوں کو دین کی طرف دعوت دے رہے تھے، علامہ اقبالؒ نے بھی امید کی ایک شمع روشن کر رکھی تھی، لیکن ان سب کا کام، زیادہ تر صرف پیغام تک محدود تھا۔ ان میں سے کوئی بھی آگے بڑھ کر، اقامتِ دین کا جھنڈا اُٹھا کر، منظم جدّوجہد کی راہ پر قدم اُٹھانے کے لیے حوصلہ، ہمّت اور آمادگی اپنے اندر نہ پاتا تھا۔

ان حالات میں، خالص دین کی بنیاد پر مسلمانوں کی صف بندی کرنے کے لیے عملی تحریک برپا کرنے کی سعادت مولانا مودودی رحمتہ اللہ علیہ کے حصّے میں آئی۔ اُنھوں نے نہ صرف مغربی تہذیب کا طلسم توڑا، اسلام کا تصوّر بحیثیت ایک جامع نظامِ زندگی کے اجاگر کیا، بلکہ اسلام میں جہاد کا مقام اور اس کی اہمیت کا احیاء کیا۔ مولانا مودودیؒ نے مسلمانوں کو پکارا کہ جن حالات سے ان کو سابقہ درپیش ہے، ان حالات میں اقامتِ دین "فرضِ کفایہ نہیں بلکہ فرضِ عین ہوتا ہے، اور ہر وہ شخص قابلِ مواخذہ ہو گا جو قدرت واستطاعت کے باوجود اقامتِ دین اور حفاظتِ دین کے لیے جان لڑانے سے گریز کرے گا۔" ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی واضح کیا کہ "احکامِ کفر کے مقابلہ میں احکامِ الٰہی کے اجرا کی کوشش بہرحال اجتماعی جدّوجہد کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اس کے لیے جماعت کا وجود، اور جو جماعت موجود ہو اس کا التزام، ضروری ہے۔" (رسائل و مسائل، چہارم)

اُنھوں نے کھول کھول کر یہ بات سمجھائی کہ اقامتِ دین کا مقصد ہی وہ اصل مقصد ہے جس کی خاطر انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے۔ یہی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد تھا۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله (الفتح:۲۸)

اور یہی امتِ مسلمہ کا اصل مقصد اور فریضہ ہے۔ امّت کے ہر فرد پر فرض ہے کہ وہ

فریضۂ اقامتِ دین کی اس منظم جدّوجہد میں اپنا حصّہ ادا کرے، اور اس کے لیے اپنے آپ کو ایک جماعتی نظم کے سپرد کر دے۔

**كنتم خير امته اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر و تومنون بالله** (آل عمران:۱۱۰)

**و كذالك جعلنكم امته وسطا" لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيدا** (البقرہ: ۱۴۳)

اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچنے کے لیے، اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کا راستہ بھی یہی ہے کہ ایک مومن اپنی پوری زندگی اور وسائل اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے جہاد میں لگا دے۔

یہی وہ دو باتیں تھیں جنھوں نے بے شمار سعید رُوحوں کو مضطرب کر دیا، انہوں نے مولانا مودودیؒ کی پکار پر لبیک کہا، اور ۲۶ اگست ۱۹۴۱ کو لاہور میں جماعتِ اسلامی قائم ہو گئی۔

پچاس سال پہلے اگرچہ چند ہی رفقاء سفر اکٹھے ہوئے، وہ بھی اکثر متوسط درجہ کے بے وسائل نوجوان، لیکن مولانا مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے یہ سفر اس یقین کے ساتھ شروع کیا کہ ایک وقت آئے گا کہ سرمایہ داری نظام کو واشنگٹن اور لندن میں اور اشتراکیت کو ماسکو میں پناہ نہیں ملے گی۔ اسلام کو نظامِ غالب بنانے کی یہ تحریک بظاہر بے سرو سامانی کی حالت میں شروع کی گئی۔ لیکن اس کا اصل سرمایہ چند مومن افراد کا اخلاص تھا، اور یہ ایمان تھا کہ حق بذاتِ خود ایک قوت ہے۔ ان کو یقین تھا کہ جب اہلِ حق اخلاص کے ساتھ راہِ حق میں نکلتے ہیں تو اللہ کی نصرت آتی ہے، اور فیصلہ کرنے والی ذات خود اللہ ربّ العالمین ہے۔ اگر صالحین کا ایک ایسا گروہ وجود میں آجائے جو اس کے راستے میں مخلصانہ جدّوجہد کرکے ثابت کر دے کہ وہ زمین کی وراثت کی صلاحیت رکھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ دنیا کی زمامِ کار مفسدین سے اس کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

ہم سب سے پہلے اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ پچاس سالوں میں مولانا مودودیؒ کا قائم کردہ قافلۂ حق کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ ۱۹۴۱ کے اجتماع میں اگر ۷۵ افراد تھے، اور ۱۹۶۳ میں تقریباً سات ہزار، تو ۱۹۸۹ میں تقریباً ۷۰ ہزار افراد جماعتِ اسلامی کے کل پاکستان

اجتماع کے لیے جمع ہوئے۔ انتخابات کا طریقہ ہی، ارکان کے اجتماعِ عام کے فیصلے کے مطابق، وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم اپنا اصل مقصد ـــــ زمامِ کار کی تبدیلی یا انقلابِ امامت ـــــ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان انتخابات کے نتیجہ میں اگر ایک وقت ہماری قوت صفر تھی، تو آج ہم پارلیمانی زندگی میں ایک مضبوط قوت کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ یہ کوئی کم بڑی بات نہیں کہ ایک لادین اور سوشلسٹ قیادت کو ہم نے انتخابات ہی کے ذریعہ سے اقتدار سے ہٹانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ۱۹۴۹ کی قرار دادِ مقاصد، ۱۹۵۶ اور ۱۹۷۳ کے اسلامی دستور، اور ۱۹۹۱ کے شریعت بل بلاشبہ ایسے اقدامات ہیں جن کے نتیجہ میں مطلوبہ روئیدگی نمودار نہیں ہوئی، اور اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آیا، لیکن ان اقدامات نے، جمہوری ذرائع سے اور کشت و خون کے بغیر، پاکستان کو کس طرح اسلامی ریاست کے راستہ سے باندھ دیا، اور اس راستہ پر کتنا آگے بڑھا دیا، اس کا اندازہ ترکی، مصر، شام و عراق اور انڈونیشیا جیسے ممالک کو دیکھ کر آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

معاشرہ میں بگاڑ بڑھا ہے، لیکن ہماری اصلاح و تعمیر اور دعوت کی سرگرمیوں کے بغیر یہ معاشرہ کہاں پہنچ چکا ہوتا، اس کا اندازہ کرنا کچھ دشوار نہیں۔ ہماری دعوت کے نتیجہ میں لاکھوں افراد نہ صرف اپنی زندگیاں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق گزارنے میں لگے ہوئے ہیں، بلکہ عملاً معاشرے کو، دعوت کے صبر آزما کام کے ذریعہ، اسلامی بنانے کے لیے اپنا جان و مال لگا رہے ہیں۔ آج آپ کسی شعبۂ زندگی میں چلے جائیں، آپ کو جماعتِ اسلامی کی دعوت کے اثرات نظر آجائیں گے۔ ملک ہی نہیں، آپ دنیا کے کسی حصّہ میں جائیں، وہاں اسلام کے لیے جدّوجہد کرنے والوں میں اقامتِ دین اور تحریکِ اسلامی کے حوالے سے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودیؒ کو معروف اور محترم و مکرم پائیں گے۔ ہر جگہ براہِ راست جماعتِ اسلامی کے وابستگان کو متحرک پائیں گے۔ بنگلہ دیش میں پارلیمنٹ میں توازنِ قوت جماعتِ اسلامی کے ہاتھ میں ہے۔ کشمیر میں ہندوستان کی غلامی سے آزادی کی جدّوجہد میں جماعتِ اسلامی پیش پیش ہے۔ برطانیہ، یورپ اور امریکہ میں جماعت سے وابستگان کی منظّم جماعتیں کام کر رہی ہیں۔

یہ جو کچھ حاصل ہوا ہے، محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے حاصل ہوا ہے۔ اس پر ہم اس کا جتنا شکر ادا کریں، وہ کم ہے جو کچھ نہ ہو سکا، جتنا ہم منزل سے دور ہیں، وہ سراسر ہماری کمزوریوں اور خامیوں کا نتیجہ ہے۔ اس پر ہم جتنا استغفار کریں، حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو گا۔ لیکن

سب سے بڑھ کر جس چیز کا شکر ہم پر واجب ہے اور جو چیز' یہ ساری دنیاوی کامیابیاں نہ بھی حاصل ہوتیں تو بھی' ہماری اصل متاع اور حاصل جدوجہد ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو بنیادی مقاصد' قرآن وسنت کی روشنی میں' آج سے پچاس سال پہلے' ہم نے اپنے لیے متعین کیے تھے' ہم انھی مقاصد کی طرف چل رہے ہیں۔ اور اسی طریقِ کار کے مطابق چل رہے ہیں جو ہم نے قرآن و سنت کی روشنی میں پچاس سال پہلے اپنے لیے وضع کیا تھا۔

انفرادی لغزشوں اور غلط فیصلوں سے انسانوں کی کسی جماعت میں مفر نہیں۔ حالات میں تغیرات کے مطابق پالیسی' نظام' تدابیر' وسائل اور تکنیک میں تبدیلیاں بھی کی جاتی رہی ہیں' اور ۱۹۴۷ ہی سے کی جاتی رہی ہیں' لیکن یہ تبدیلیاں انھی اصولوں کی روشنی میں کی جاتی رہی ہیں جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں' جن کی توضیح خود بانیٔ جماعت نے فروری ۱۹۵۷ میں ماچھی گوٹھ میں ارکان کے اجتماعِ عام میں کی تھی' اور جن کی تصویب ارکانِ جماعت نے کر دی تھی۔ قرآن و سنت کے منصوص احکام کو تبدیل کرنا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں' اور جو جماعت اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے اُٹھے اس کے لیے تو یہ لازم ہے کہ وہ اسی طریقِ کار سے اپنی منزل کی طرف بڑھے جو طریقِ کار رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔ آپؐ کی طے کردہ حدود کے اندر رہے' جن چیزوں سے آپؐ نے روکا اُن سے رکی رہے' اور جن وسعتوں اور جس تنوع کو آپؐ نے اختیار کیا یا اجازت دی' ان میں اجتناب اور تنگی اختیار کرنے سے احتراز کرے۔

مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں' اور یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان ہے' کہ ہم آج ۱۹۹۱ میں وہی الفاظ بلا تامّل دہرا سکتے ہیں جو الفاظ بانیٔ جماعت نے ۱۹۵۷ میں ارشاد فرمائے تھے۔ یہ الفاظ جماعت کے ان چند لوگوں کو مخاطب کرکے کہے گئے تھے جو خود مولاناؒ کی تحریروں سے مولاناؒ کے خلاف یہ مقدمہ قائم کر رہے تھے کہ ۱۹۴۷ کے بعد جماعت نے اُن کی قیادت میں پالیسی اور تدابیر میں جو تبدیلیاں کی ہیں' اور جو تیز تر عوامی اور سیاسی جدوجہد شروع کر دی ہے' اس کی وجہ سے وہ اپنے اس اصل طریقِ کار سے ہٹ گئی ہے جس کی خود اُنھوں نے تعلیم دی تھی۔ دینی احکام میں حکمتِ عملی کے نام پر تبدیلی کر دی گئی ہے' ترمیم و تحریف کا اختیار حاصل کر لیا گیا ہے' جماعت کا اخلاقی و دینی معیار گر گیا ہے۔ اُنھوں نے فرمایا:

> انفرادی لغزشوں اور کوتاہیوں سے تو بہرحال کوئی جماعت خالی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اجتماعی حیثیت سے جماعتِ اسلامی ان اصولوں کی پوری پابندی کرتی رہی

ہے (جو عقیدہ، نصب العین، شرائط رکنیت اور مستقل طریق کار کے تحت دستور میں درج کیے گئے ہیں)....

جماعت اسلامی ابتدا سے ایک سوچے سمجھے نقشے پر کام کر رہی ہے۔ اس نقشے کی تفصیلات تو ہمارے ذرائع وسائل کی ترقی کے ساتھ بڑھتی اور پھیلتی رہی ہیں، لیکن اس کے بنیادی خطوط وہی رہے ہیں جو اول روز سے اس کام میں ہمارے پیش نظر تھے (تحریکِ اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل، ص ۵۹-۷۳)

جماعتِ اسلامی اگر اپنے نصب العین اور بنیادی اصولوں پر قائم رہی ہے تو یہ سراسر اللہ تعالیٰ کے فضل، قرآن و سنّت کی طرف رجوع اور اُن کے التزام کی سعی، اور مولانا مودودیؒ کی بصیرت سے بھرپور رہنمائی ہی کا نتیجہ ہے۔

---

جماعتِ اسلامی نے اپنے لیے جو طریق کار کتاب اللہ اور سنتِ نبویؐ سے اخذ کیا وہ چار بنیادی اصولوں یا معالم و حدود پر مبنی تھا۔

۱- خدا اور رسولؐ کی ہدایت کا پابند رہنا۔

۲- لوگوں کو، انفرادی اور اجتماعی طور پر، وسیع سے وسیع پیمانہ پر، اللہ کی طرف بلانا، یعنی دعوت الی اللہ۔

۳- جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں، اُن کا تزکیہ و تربیت کرنا اور اُنھیں منظم کرنا، یعنی تربیت و تنظیم۔

۴- اس منظم گروہ کو اصلاح معاشرہ اور انقلابِ امامت کے لیے جدوجہد کے کام میں مصروف عمل کرنا، تاکہ ہر شعبۂ زندگی میں اللہ کا دین غالب ہو، یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔

خلافِ صداقت و دیانت ذرائع کے استعمال سے اجتناب، اصلاح و انقلاب کے لیے جمہوری و آئینی طریقوں سے کام کرنا، رائے عامہ کے ذریعے مطلوبہ تغیرات بروئے کار لانا، کھلم کھلا اور علانیہ کام کرنا ـــــ غور کیا جائے تو یہ سب اصول درج بالا چار اصولوں ہی کا منطقی نتیجہ ہیں، انھیں سے مستنبط ہیں۔

اس کام کے لیے معقول اور فطری طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی طرف دعوت دینے والا سب سے پہلے خود اپنے آپ سے ابتدا کرے۔ وہ اپنی زندگی میں تضادات کو دور کرنے، اللہ کے رنگ ـــ

میں اپنے آپ کو رنگ دینے' اور خود اپنی دعوت کا نمونہ بن جانے کی مسلسل کوشش میں لگ جائے۔ ساتھ ہی وہ اپنے گھر اور اہل وعیال' اعزہ و اقربا اور اپنے ہمسایوں تک یہ دعوت پہنچائے۔

اس کے ساتھ ساتھ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ پوری قوم کو اور عالمِ انسانیت کو (حسبِ استطاعت) اللہ کی طرف دعوت دے' اور اصلاحِ معاشرہ' تبدیلیِ حکومت اور انقلابِ قیادت کے لیے بھی مقدور بھر کام کرے۔ ان میں سے کوئی کام کسی دوسرے کام کی خاطر نہ ملتوی کیا جا سکتا ہے' نہ مؤخر۔ نہ اسے ترک کیا جا سکتا ہے۔ ہاں' کمی بیشی اور تقسیمِ کار ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی اس کا فرض ہے کہ نظمِ جماعت اس سے جو کام لینا چاہے اور جہاں اسے لگانا چاہے' وہ پوری وفاداری سے اپنی صلاحیتیں اس کے سپرد کر دے۔

نظمِ جماعت کے لیے' ابتدا سے قرآن و سنّت کی روشنی میں جو اصول وضع کیے گئے ان میں سمع وطاعت فی المعروف' مشاورت' باہمی الفت و محبت اور احتساب اہم ترین اصولوں کے طور پر شامل تھے۔

---

ان اصولوں اور اس نقشۂ کار کی پابندی جس طرح روزِ اول سے کی جارہی ہے آج بھی کرنا ضروری ہے۔ بلکہ آج زیادہ ہی ضروری ہے۔ آج ہمیں سنگین تر چیلنجوں سے سابقہ درپیش ہے۔ ہماری تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ معاشرے کا بگاڑ بھی بڑھ گیا ہے۔ دنیا ایک آنگن بن گئی ہے' اور تحریکِ اسلامی ایک عالمگیر حقیقت۔ اب اس کے دشمن اپنے ملک ہی میں نہیں ہیں' بلکہ غالب سامراجی قوتیں بھی اس کے درپے ہیں۔ جدید وسائل حمل و نقل اور ذرائع ابلاغ نے غالب لادینی تہذیب کو ایک ایک گھر میں گھسنے کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ ان حالات میں جماعت کا کوئی ادنیٰ کارکن بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ تحریک اپنے بنیادی اصولوں اور نقشۂ کار میں کچھ ترک کرکے یا کچھ لچک پیدا کرکے اپنے نصب العین کی طرف پیش قدمی کر سکتی ہے۔

جماعت کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے' انھی حقائق کا ادراک کرتے ہوئے' آج کے مرحلہ میں دعوت کے کام کو اپنے منصوبوں میں اولین ترجیح دی ہے۔ اور یہی ہدایت سارے کارکنوں کو کی ہے۔ صرف اولین ترجیح دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا ہے' بلکہ دعوت الی اللہ کے بنیادی موضوعات واضح کیے ہیں' طریقوں کا تعیّن کیا گیا ہے' گھر گھر کو ہدف بنا کر دعوت پہنچانے کا پابند

کیا گیا ہے' وفود بنا کر اور دعوتی کیمپ لگا کر دعوت پہنچانے کا پروگرام دیا گیا ہے۔ ہر کارکن کو دو افراد ایک محنت کار کی طرح مسلسل زیرِ تربیت رکھنے اور اہلِ خانہ کی تربیت کے لیے ان کا اجتماع کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اگر ہم اپنے گھروں میں ایک اسلامی ماحول قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو نہ صرف افراد خانہ ایک دوسرے کے پشتیبان بنیں گے' بلکہ وہ اپنے ماحول میں بھی ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کرنے کا ذریعہ بنیں گے۔

عملی طور پر' تبلیغی لٹریچر کے ہزاروں سیٹ کارکنوں کو کم قیمت پر فراہم کیے گئے ہیں' اور آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کے جدید ذرائع اختیار کیے گئے ہیں۔ اسی طرح اپنی تربیت' اور اقامتِ صلوٰۃ اور نماز باجماعت کی پابندی' اور محلوں میں توسیع دعوت کے مقاصد کے لیے فجر کی نماز میں حاضری' اور مساجد کے گرد احباب کے حلقے بنانے کا پروگرام دیا گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کارکن اس پورے منصوبہ کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھیں' اور پچاسویں سال کے اختتام پر اس کو عملی جامہ پہنانے کا بھرپور عزم ایک دفعہ پھر تازہ کریں۔

عوام میں اثر و نفوذ کی تیز تر مساعی کے باوجود' تربیت کے ضمن میں معمول کے سارے پروگرام اسی طرح جاری ہیں جس طرح وقتاً" فوقتاً" وضع کیے جاتے رہے ہیں۔ مرکزی تربیت گاہ سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ دائرہ تعلیم و تربیت کا آغاز کرکے ایک ایسی تربیت گاہ کے اس خواب کو بھی عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جارہی ہے جو دنیا میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے بہترین کارکن تیار کرے۔ (روداد اول' ص ۳۶) لیکن تربیت کی یہ ساری کوششیں کافی نہیں ہیں۔ ان کو تیز تر اور وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے۔ پانچ سالہ منصوبہ میں جو بنیادی رہنما اصول طے کیے گئے ہیں اور جو طریقے تجویز کیے گئے ہیں' کارکنوں اور جماعتوں کو پورے اہتمام سے ان کا التزام کرنا چاہیے۔ خصوصاً ہر کارکن کو اپنی تربیت آپ کے اصول پر' سب سے بڑھ کر اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کی کوشش میں لگا رہنا چاہیے۔ تربیت یافتہ کارکن ہماری تحریک میں مرکز و محور اور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تحریک کے لیے موجودہ مرحلے میں عوام کو سنبھالنے کے لیے باصلاحیت' تربیت یافتہ کارکنوں کی شدید ضرورت ہے۔

یہاں دعوت و تربیت کے ضمن میں یہ اعتراف ضروری ہے کہ ہدایات اور منصوبوں کے باوجود عملی کارکردگی میں بہت کوتاہیاں ہیں۔ مگر انسانوں میں عزائم' منصوبوں اور ہدایات اور ان پر عمل اور نتائج کے درمیان ہمیشہ تفاوت ہوا کرتا ہے۔ انسان عزم کا کچا ہے۔ یہ بات خامیوں

کوتاہیوں اور سہل انگاریوں کے لیے وجہ جواز ہرگز نہیں بنائی جا سکتی۔ لیکن اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ تفاوت ہمیشہ رہا ہے۔ تعلیمِ بالغاں ہو' اعلیٰ درجہ کی تربیت گاہ کا قیام ہو' نئے نظامِ تعلیم کے مطابق مدارس اور اداروں کا قیام ہو' علمی و تحقیقی کام ہو' معیارِ ارکان کا معاملہ ہو' حلقہ متفقین کا وہ پروگرام ہو جو ۱۹۵۱ میں پنجاب کے پہلے انتخابات کے بعد وضع کیا گیا اور جسے قرار داد ماچھی گوٹھ کے ساتھ منسلک کیا گیا --- عزائم اور عمل کا تفاوت ہر جگہ موجود رہا ہے۔ یہ آج بھی موجود ہے۔ لیکن اس تفاوت کے باوجود گزشتہ پچاس سال میں جماعتِ اسلامی نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اور انشاء اللہ آئندہ بھی کرے گی۔

جماعت میں ارکان و وابستگان کے اخلاقی و دینی معیار کے گرنے کا مسئلہ بھی بار بار ذہنوں میں اُٹھتا ہے' اور اُٹھایا بھی جاتا ہے۔ یہ بحث بھی روزِ اول سے چلی آرہی ہے۔ رودادیں ارکانِ جماعت کی حالت پر شکایات سے بھری ہوئی ہیں۔ جائزہ کمیٹی نے تو ایسی تصویر کھینچی تھی --- آج سے ۳۵ سال قبل --- کہ مولانا مودودیؒ کو یہ کہنا پڑا تھا کہ "اگر ساری جماعت بحیثیت مجموعی بگڑ گئی ہے تو اسے توڑ دیجیے۔" پھر یہ بھی کہ "پوری جماعت کے متعلق --- ہر پہلو سے کامل اطمینان کی رپورٹ شاید آپ کبھی نہ پائیں گے۔" آخری بات اُن کی اس ضمن میں یہ بھی اہم ہے کہ "میرے علم میں ایسا کوئی طریقِ تربیت اب تک نہیں آیا ہے جو معیارِ مطلوب کے آدمی تیار کرنے کی سو فیصد ضمانت دیتا ہو۔" (آئندہ لائحہ عمل) ---

لیکن میں پھر یہ کہوں گا کہ یہ باتیں جواز' تاویل اور غفلت کی بنیاد نہ بننا چاہییں ہاں' مایوسی سے بچنے اور رومانوی دنیا سے نکل کر حقیقت پسند بننے کے لیے ان کا ادراک ناگزیر ہے۔

---

جماعت کی پچاس سالہ ترقی کا راز جہاں اپنے نصب العین' بنیادی اصولوں اور نقشہ کار کی پابندی میں مضمر ہے' وہاں یہ بات ثبات و تغیّر کے ان حکیمانہ اصولوں پر کاربند رہنے کا نتیجہ بھی ہے جن کی تعلیم قرآن و سنّت میں دی گئی ہے' اور جن کی توضیح مولانا مودودیؒ نے ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں بڑی تفصیل سے فرمائی۔ آج کے مرحلہ میں بھی جماعت اگر پیش قدمی کر سکتی ہے تو اسی بصیرت' اور ثبات و تغیّر کی اسی حکمتِ عملی کو اختیار کر کے کر سکتی ہے جو مولانا مودودیؒ نے اختیار کی۔ جو جماعتیں یہ نہ سمجھ سکیں کہ کیا بدل سکتا ہے اور کیا نہیں بدل سکتا' جو ہر چیز بدلنے کو تیار ہوں یا ہر تبدیلی سے بدکتی ہوں' وہ اپنے مقصد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہیں' اور اُن

کو زمانہ ایک داستانِ پارینہ بنا کر چھوڑ دیتا ہے۔

پہلا اصول یہ واضح کیا گیا کہ "تدابیر کا ردّ و بدل ایک دوسری چیز ہے' جسے بعض لوگ غلطی سے اصول کا ردّ و بدل قرار دے بیٹھتے ہیں۔" (آئندہ لائحہ عمل' ص ۵۹)

دوسرا اصول یہ واضح کیا گیا کہ "فطری طریقِ انقلاب کا یہ تصور کہ وہ کوئی لگا بندھا طریقہ ہے جو ہر جگہ ہر طرح کے حالات میں ایک ہی ڈھنگ پر چلنا چاہیے' سراسر ایک غیر معقول تصور ہے۔" (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۵۸)

تیسرا اصول یہ واضح کیا گیا کہ "ایک طریقِ کار کے بنیادی اصولوں اور حالات پر ان کے عملی انطباق کی مختلف اشکال کے درمیان فرق کرنا عقل مندی کا تقاضا ہے۔" (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۱۷)

چوتھا اصول یہ واضح کیا گیا کہ "دنیا میں کوئی جماعت بھی ایک تدبیر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پکڑ کر نہیں بیٹھ سکتی۔" (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۵۹)

پانچواں اصول یہ واضح کیا گیا کہ "خصوصیت کے ساتھ جن لوگوں کو سخت مخالف و مزاحم ماحول میں سے اپنا راستہ نکالنا ہو' ان کے لیے تو یہ ناگزیر ہے اور دانائی کا تقاضا بھی کہ اگر ایک وقت انھوں نے ایک تدبیر کو صحیح اور مناسب پاکر اختیار کیا ہو اور دوسرے وقت وہ تدبیر موزوں اور کارگر نہ رہے' تو وہ بلا تامل اس کو کسی بہتر اور حالات کے لحاظ سے مناسب تر تدبیر سے بدل لیں۔" (آئندہ لائحہ عمل' ص ۵۹-۶۰)

چھٹا اصول یہ واضح کیا گیا کہ "دانائی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ حالات میں واقع ہونے والے اہم تغیرات کا نوٹس لیا جائے اور بدلے ہوئے حالات کے لحاظ سے طریقِ کار میں ضروری ردّ و بدل سے گریز نہ کیا جائے۔ (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۱۷)

---

ثبات و تغیر کے ان اصولوں کا اطلاق ہم گزشتہ پچاس سال میں جس طرح کرتے رہے ہیں اس کا ایک مختصر جائزہ فائدہ سے خالی نہ ہو گا۔

ہم طریقِ کار میں قرآن و سنّت کی ہدایات کے پابند ہیں۔ لیکن ہر صاحبِ علم آدمی یہ جانتا ہے کہ قرآن و سنّت کے احکام کی فہم و تعبیر میں بھی انسانوں کے درمیان اور مختلف زمانوں میں اختلاف و تبدیلی کا عمل جاری رہا ہے۔ یہی معاملہ ہمارے ساتھ پیش آتا رہا ہے۔ مثلاً تاسیسِ

جماعت کے وقت ہم نے یہ تعبیر اختیار کی کہ "علمِ کتاب و سنّت اور حکمتِ عملی دونوں کا اقتضا یہی ہے کہ ــــ امیر کا انتخاب کسی مدت کے ساتھ مقید نہ ہو۔" (روداد اول' ص ۳۰) بعد میں ہم نے اپنے دستور میں امیر کے انتخاب کو پانچ سال کی مدت کے ساتھ مقید کیا۔

جب محترمہ فاطمہ جناح کے انتخاب کا مسئلہ پیش آیا تو' عورت کی سربراہی کو ناجائز سمجھنے کے باوجود' مرکزی مجلسِ شوریٰ نے طے کیا کہ "شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت میں تبدیل نہیں ہو سکتی' اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت کے موقع پر' ضرورت کی حد تک' جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے" چنانچہ آمریت سے نجات پانے کی ضرورت کے لیے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا گیا' مگر یہ واضح کر دیا گیا کہ نہ یہ فیصلہ آئندہ کے لیے نظیر ہو گا' نہ اس سے حکم کی شرعی نوعیت بدل سکتی ہے۔

ایک وقت یہ سوال بھی اُٹھایا گیا کہ اگر انتخابات صرف ایک لادینی دستور کے تحت ہی ممکن ہوں یا انتخابات کا دروازہ مسدود ہو' تو کیا ایسے انتخابات میں حصہ لیا جا سکتا ہے (جو ہمارے عقیدہ کے خلاف ہے) ' یا مسلّح انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ "موجود الوقت دستوری طریقوں ہی سے نظامِ حکومت کا ہمارے ہاتھوں میں آجانا ممکن ہو تو ہمیں اس موقع سے فائدہ اُٹھانے میں کوئی تامّل نہ ہو گا۔ اس لیے کہ ہمیں جو کچھ واسطہ ہے اپنے مقصد سے ہے نہ کہ کسی خاص طریقے سے۔" اور اگر پُرامن ذرائع سے ممکن نہ ہو تو "ہم دعوتِ عام جاری رکھیں گے اور تمام جائز شرعی ذرائع سے انقلاب برپا کرنے کی کوشش کریں گے۔" (آئندہ لائحۂ عمل' ص ۱۰۵-۱۰۶)

۱۹۴۷ میں قیامِ پاکستان کے بعد حالات میں جو عظیم تغیر رُونما ہو گیا' مولانا مودودیؒ کی قیادت میں جماعت نے اس کا بروقت نوٹس لیا اور بدلے ہوئے حالات میں اپنے ابتدائی طریقِ کار میں ردّ و بدل کیا۔ مولانا مودودیؒ نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ کو لاء کالج لاہور میں تقریر کرتے ہوئے ۴ نکاتی مطالبۂ نظامِ اسلامی پیش کیا' اور اسی طرح اگست ۱۹۵۲ میں مطالبۂ دستورِ اسلامی پیش کیا۔ ان مطالبات کو منوانے کے لیے جماعت نے رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے عوام سے جذباتی اپیل بھی کی' اور عوامی جدّوجہد بھی شروع کر دی۔ "یوں ہماری تحریک نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔" (آئندہ لائحۂ عمل' ص ۱۴۰) بعد میں مرکزی مجلسِ شوریٰ نے' اور آٹھ سال بعد ارکان کے اجتماعِ عام نے اس دُور رس تبدیلی کی توثیق کر دی۔

مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں "ہم سخت نادان ہوتے اگر اس موقع کو ہاتھ سے کھو دیتے اور اپنے آپ کو قبلِ تقسیم ہی کی پوزیشن میں سمجھے بیٹھے رہتے۔" (آئندہ لائحہَ عمل' ص ۱۲۸) اور اگر "ہم ان حالات میں قبلِ تقسیم کے طریق پر ہی کام کرتے رہتے تو اپنے مقصد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے۔" (آئندہ لائحہَ عمل' ص ۱۳۰)

ہم نے اپنے اپیل کے طریقے میں تبدیلی کی۔ ہم نے اپنے کام کے ڈھنگ میں تبدیلی کی۔ پہلے ہم دعوت کا کام چند متعین طریقوں سے بہت محدود پیمانے پر کر رہے تھے۔ اب ہم نے مطالبہَ نظامِ اسلامی کے وسیلے سے لاکھوں آدمیوں تک دعوت پہنچانے' اور ہزاروں کو اپنی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنے کا کام شروع کر دیا۔ ہم نے یہ سمجھ لیا کہ مستحکم توسیع تو "دھیمی رفتار سے محدود پیمانے پر ہی ہو سکتی ہے۔" اور اس وقت تک کام اسی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ اس مستحکم مگر سست رفتار توسیع سے نئے حالات کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ بات بھی صحیح نہ ہوتی کہ "بڑے پیمانے پر توسیع کے جو مواقع ہمیں حاصل تھے ان کو ہم چھوڑ دیتے' اور بجائے خود اس توسیع کے جو فوائد ہیں ان کو نظرانداز کر دیتے۔" اس طرح ہم نے اپنی پیش قدمی کی رفتار بھی تبدیل کی۔ کشمکش کی راہ پر تدریجی ارتقاء کے ساتھ بڑھتے بڑھتے ہم نے "دفعتہ" جدوجہد کے مرحلے میں قدم رکھ دیا۔" اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دستورِ اسلامی کے مطالبہ پر کشمکش کا آغاز کر دیا۔" (آئندہ لائحہَ عمل' ص ۱۴۳-۱۴۶)

عوامی جدوجہد کے میدان میں آئے تو ریزولیشن بھی پاس ہوئے' جلوس بھی نکلے' زندہ باد اور سیدی سیدی' مُرشدی مُرشدی کے نعرے بھی لگے' جھنڈے بھی بنے' ہار بھی پہنائے گئے' استقبالیے بھی دیے گئے' تھیلیاں بھی پیش کی گئیں' غلافِ کعبہ کا گشت بھی ہوا۔ اور بالآخر یوم شوکتِ اسلام بھی منایا گیا۔ اور یہ سب کچھ مولانا مودودیؒ کی زیرِ قیادت ہوا' حالانکہ خود اُن کی یہ تحریر موجود تھی کہ ریزولیشن' جلوس' نعرے وغیرہ اس تحریک کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ فقیہ تھے' لکیر کے فقیر نہ تھے۔

ان میں سے کوئی تبدیلی بھی نہ اصول کی تبدیلی تھی' نہ بنیادی تبدیلی۔ لیکن بعض لوگ عمل درآمد کی ہر نئی شکل کو دیکھ کر مضطرب ہو جاتے ہیں' سمجھتے ہیں کہ اصول بدل گئے اور جماعت اپنی راہ سے ہٹ گئی۔ ان کو بتایا گیا کہ "جو شخص حالات اور مواقع اور ذرائع کی تبدیلی کے ساتھ ان اصولوں پر عملدرآمد کی شکلیں نہ بدل سکے اس کی مثال میرے نزدیک اسی عطائی طبیب کی سی ہے جو کسی حکیم کی بیاض کا ایک نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کر کے تمام مریضوں

پر اسے جوں کا توں استعمال کرتا چلا جائے۔"

اس طرح جب مولانا مودودیؒ نے یہ سمجھا کہ جماعت کا نظام بوجوہ آنے والے دور کی ساری ضروریات کو اپنے اندر نہیں سمیٹ سکے گا' تو نہ صرف جماعت میں متفق کا درجہ بنایا گیا' بلکہ متبادل انتظامات بھی کیے گئے۔ طلبہ کے لیے علیحدہ تنظیم قائم ہوئی' جو نہ ہر سطح کے جماعتی نظم کے تحت تھی اور نہ قانوناً مرکز کے تحت۔ اس کے بعد' مزدوروں کے لیے' کسانوں کے لیے' اساتذہ کے لیے' اور کئی دیگر ضروریات کے لیے مختلف نظم قائم ہوتے چلے گئے۔ کسی کے بارے میں یہ نہ سمجھا گیا کہ کوئی جماعت کے نظم کے متوازی نظم قائم کیا جارہا ہے۔ جب یہ سمجھا گیا کہ برائی بیباک اور جری ہو گئی ہے اور نیکی اور شرافت پست ہمتی' بزدلی اور کمزوری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے' تو نہ صرف جماعت کے نظم کو اس صورتِ حال کے مداوا کے لیے تیار کیا گیا بلکہ ڈیموکریٹک یوتھ فورس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسی ضمن میں غنڈہ گردی اور فواحش کے انسداد کے سلسلہ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ "ہم صرف اخلاقی تلقین پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے' بلکہ معاشرہ کے شریف عناصر کو ان برائیوں کے مقابلے میں منظم کر کے ان کے خلاف عملی جدوجہد کرنا چاہتے ہیں۔" (آئندہ لائحہ عمل' ص ۸۱) اس کے بھی یہ معنی نہ تھے کہ ہم آئینی و جمہوری ذرائع ترک کر کے تشدد کی راہ پر گامزن ہو رہے تھے۔

کیونکہ ہمارا طریقِ کار ہمیں جمہوری و آئینی ذرائع کا پابند کرتا ہے' اور ہم نے انتخابات ہی کو تبدیلیِ قیادت کے ذریعہ کے طور پر اختیار کیا ہے' اس لیے جمہوریت کے دفاع میں ہم ہمیشہ پیش پیش رہے' اور ہم نے ہمیشہ مارشل لاء کی مخالفت کی۔ مارشل لاء نے خواہ اسلام کے خلاف پوزیشن لی ہو یا اس کے حق میں' ہم نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔ آمریت سے نجات پانے کے لیے ہم نے سہروردی' بھاشانی' مجیب الرحمٰن' ولی خان' جیسے لوگوں تک سے تعاون کرنے سے دریغ نہ کیا۔ یہ آمریت خواہ فوجی لبادے میں ہو' خواہ شہری لباس میں۔ جب مارشل لاء نے اسلام کے نفاذ کا نعرہ بلند کیا تو اس وقت بھی' مجلسِ شوریٰ کی قرار دادیں گواہ ہیں' ہم اس کے فریب میں نہ آئے' اور مسلسل بحالیِ آئین و جمہوریت اور انعقادِ انتخابات کا مؤقف اختیار کیے رہے۔

آج بھی کاروانِ دعوت و محبت' پبلک ریلیاں' بڑے بڑے جلوس' اسلامی جمہوری اتحاد' پاسبان' وغیرہ وغیرہ ---- یہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ یہ تاریخ کا تسلسل ہے جو جاری ہے' اور جاری رہے گا۔ ۱۹۴۷ کے بعد بھی تبدیلیاں' نئی تدابیر' اور

ایک ہی اصول کے عمل کی بدلتی ہوئی شکلیں دیکھ کر کچھ لوگ مضطرب ہو جایا کرتے تھے۔ آج بھی ایسا ہوتا ہے۔ ان کو نہ صرف ثبات و تغیّر کے درج بالا وہ چھ اصول سامنے رکھنا چاہییں جن کو مولانا مودودیؒ نے بیان فرمایا‘ بلکہ اُن کے یہ الفاظ بھی یاد رکھنا چاہییں کہ ”تبدیلی کے معنی یہ نہیں کہ پہلے طریقے کو ہم نے بالکل ترک کر کے صرف اس دوسرے طریقے پر اعتماد کر لیا۔ اس توسیعی کوشش کے ساتھ ہم اپنے سابقہ طریقے کے مطابق استحکام کی سعی بھی کرتے رہے ہیں اور اس کی اہمیت و ضرورت ہماری نگاہوں میں علیٰ حالہٖ قائم ہے۔“ (آئندہ لائحہ عمل‘ ص ۱۴۴)

---

آج کے مرحلہ میں ہماری تحریک کو جو بڑے بڑے چیلنج درپیش ہیں‘ جن بدلتے ہوئے حالات کا سامنا ہے‘ وہ ہماری بنیادی فکر کا منطقی نتیجہ ہیں۔ کیونکہ ہم آئینی و جمہوری طریقوں‘ رائے عامہ کے تغیر‘ اور انتخابات کے ذریعہ مطلوبہ انقلاب لانے کے پابند ہیں‘ اس لیے عامتہ المسلمین کو اپنے نصب العین کی حمایت میں کھڑا کر دینا ہمارے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ کیونکہ دنیا میں‘ اور خود ہمارے ملک میں‘ اصل غلبہ مغرب کی لادینی تہذیب اور استعماری قوتوں کو حاصل ہے‘ اس لیے ہمیں اسلامی تحریکات کے خلاف عالمی طاقتوں کے منصوبوں سے عہدہ برآء ہونے کے لیے منصوبہ بندی کرنی ہے۔ یہ ہمارے لیے دوسرا بڑا چیلنج ہے۔ ان دونوں باتوں کو مولانا مودودیؒ نے تحریک کے آغاز ہی میں بڑے خوبصورت انداز میں یوں واضح کر دیا تھا‘ ”ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہوتی رہیں گی اگر ان کے ساتھ ساتھ ان کی پُشت پر ایک مضبوط رائے عامہ بھی تیار نہ ہوتی جائے۔ جس طرح تعمیری کاموں کے بغیر کوئی اسلامی انقلاب رُونما نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ عامتہ النّاس میں اسلام کی دعوت پھیلائے بغیر ایسا کوئی انقلاب برپا ہو سکے۔ ہمیں نہ صرف ہندوستان‘ بلکہ حتی الامکان دنیا کے گوشے گوشے میں اپنی آواز پہنچانا ہوگی۔ کیونکہ آج کسی ایک ملک میں کوئی حقیقی انقلاب واقع نہیں ہو سکتا جب تک وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی رائے عامہ اس کی تائید میں تیار نہ کر لی جائے۔ اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے‘ کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس حد تک متاثر ضرور ہونا چاہیے کہ وہ اس چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اُٹھ رہے ہیں‘ لاکھوں انسانوں کو ہماری پُشت پر اخلاقی و عملی تائید کے لیے آمادہ ہونا چاہیے اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی تیار ہونا چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصدِ عظیم کے لیے کوئی خطرہ‘ کوئی نقصان‘ کوئی

مصیبت برداشت کرنے میں تامل نہ کریں۔ (روداد اول' ص ۲۹-۶۷)

کیونکہ صرف کسی ایک ملک میں' عالمی دعوت کے بغیر' انقلاب برپا نہیں ہو سکتا' خصوصاً آج کے جیٹ اور سیٹلائٹ کے دور میں' اور کیونکہ عالمی طاقتیں اسلامی تحریکات کو ناکام بنانے کے لیے عرصہ سے منصوبہ بندی کر رہی ہیں' اس لیے اس مرحلہ میں رفقائے جماعت کو بین الاقوامی صورتِ حال کا بھی پورا ادراک ہونا چاہیے۔

جن دنوں برعظیم ہندوپاک میں جماعتِ اسلامی کی تحریک برپا ہو رہی تھی' انھی دنوں میں مصر میں اخوان المسلمین کی تحریک حسن البناؒ شہید کی رہنمائی میں مصروف عمل تھی۔ اس کے مقاصد وہی تھے جو جماعتِ اسلامی کے مقاصد تھے۔ طریقِ کار میں جزوی فرق موجود تھا' لیکن طریقِ کار کے اصول چونکہ قرآن و سنت کی رہنمائی میں طے کیے گئے تھے اس لیے یہ کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔

جماعتِ اسلامی اور اخوان کی یہ دو تحریکیں ہی وہ تحریکیں ہیں جن کو اس وقت دنیا بھر کی اسلامی تحریکیں "حرکۃُ الاُم" بنیادی تحریکیں یا **Mother Movements** قرار دیتی ہیں۔ الاستاذ المودودیؒ اور امام حسن البناؒ اس دور کی اسلامی تحریکوں کے دو مسلّم رہنما ہیں۔ ان تحریکوں نے مسلمانوں کی جدید پڑھی لکھی نسل کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ کیونکہ جدید تعلیم یافتہ نسل کو ان تحریکوں کے لٹریچر میں اپنے تمام ذہنی سوالات کے جوابات مل گئے' اور انھیں یہ یقین حاصل ہو گیا کہ اسلام موجودہ دور میں نہ صرف قابلِ عمل ہے بلکہ ان تمام انسانی مسائل کا حل پیش کرتا ہے جن سے جدید دور کے انسان کو سامنا ہے۔

نئی نسل کے اس طرح اسلامی تحریک کی طرف لپکنے کی وجہ سے مغرب کی استعماری قوتیں پریشان ہو گئیں۔ ان کی یہ پریشانی ان کے دانشوروں کی نگارشات' ان کے جرائد اور اخبارات اور ان کی نشریات میں صاف جھلکتی ہے۔ اٹلی کے وزیر خارجہ سے "نیوز ویک" کے مشہور جریدے نے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا کہ اب جبکہ معاہدۂ وارسا کے ممالک مغرب کے لیے خطرہ نہیں رہے' تو نیٹو (NATO) کا فوجی معاہدہ کس کے خلاف ہے؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہمیں نیٹو کے بارہ ممالک کے درمیان پائی جانے والی یکجہتی کو برقرار رکھنا ہے تاکہ اگر مستقبل میں مسلمان ممالک یورپ کے لیے خطرہ بنیں تو اس کا مقابلہ کیا جا سکے۔

لندن کے مشہور جریدہ "اکنامسٹ" نے ایک مسلمان عالمِ دین اور ایک عیسائی پادری کا فرضی مکالمہ شائع کیا' جس میں "یورپ" کو آنے والے اسلامی خطرے سے خبردار کرنے کی

کوشش کی گئی ہے۔

امریکہ کے "ٹائم میگزین" نے امریکہ کے تین سو ارب ڈالر کے سالانہ دفاعی بجٹ پر بحث کرتے ہوئے پوچھا ہے کہ روس کی پسپائی کے بعد یہ دیوہیکل دفاعی بجٹ کس کے خلاف ہے' تو اسے بھی مستقبل میں مسلمانوں کا خطرہ نظر آیا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مغرب کو اس اسلامی دنیا سے کیا خطرہ ہے جو چالیس سے زیادہ ٹکڑیوں میں منقسم ہے' اور یہ چھوٹی ٹکڑیاں بھی آپس میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ بیشتر ٹکڑوں پر ایسی حکومتیں جو استعماری مصلحتوں کے تابع ہیں۔ ان ممالک کے زیادہ تر وسائل مغربی تہذیب و ثقافت کی ترویج اور اسلامی تہذیب کی بیخ کنی پر صرف ہو رہے ہیں۔ ان کی معاشی منصوبہ بندی استعماری قوموں کے مفادات کے تابع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خطرہ موجودہ حکمرانوں سے نہیں ہے۔ خطرہ اس سے ہے کہ تمام اسلامی ممالک میں ایک مضبوط توانا اسلامی تحریک پورے اعتماد اور عزم سے پیش قدمی کر رہی ہے۔ اسلامی تحریک نے قربانی کی تاریخ میں ایک لازوال باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ شوقِ شہادت اور جذبۂ جہاد کے بل بوتے پر اس نے افغانستان میں دنیا کی دوسری بڑی جنگی قوت کو پسپائی پر مجبور کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مغرب کی استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کر رہی ہے اور افغانستان سے روس کے نکلنے کے بعد امریکہ کو قطعاً یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ نئے رنگ میں انہیں غلامی کی زنجیریں پہنا سکیں۔

کشمیر کے مجاہدین نے غلامی کی صدیوں پرانی جکڑ بندیوں کو توڑ دیا ہے۔ وہ' خالص اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر' تھوڑے ہی عرصے میں اتنی زبردست تحریک شروع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ بھارت کو اپنے اٹوٹ انگ کی تقسیم کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ فلسطینیوں نے' "حماس" کے زیرِ اہتمام' اسلامی جذبے سے سرشار ہو کر' انتفاضہ کی تحریک شروع کر دی ہے' اور سیکولرزم کے جال کو توڑ دیا ہے۔ الجزائر اور شمالی افریقہ کے دوسرے ممالک کی اسلامی تحریکوں نے نئی آب و تاب پیدا کی ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں سب سے زیادہ امید افزا تبدیلی وسط ایشیا میں آئی ہے۔ ہزاروں مقفل مساجد کو مسلمانوں نے آگے بڑھ کر کھول دیا ہے۔ مقبوضہ مدارس کو پھر سے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ تازہ تازہ وسط ایشیا سے لوٹنے والوں کا مشاہدہ ہے کہ مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوئی ہیں' اور عشاء کے بعد جب بچے مسجدوں میں قرآن سیکھنے کے لیے جاتے ہیں تو تل دھرنے کو جگہ

نہیں ملتی۔ یہ اس علاقے کی صورتِ حال ہے جہاں آج سے دس سال پہلے ہمیں چند ایسے مسلمان بھی بڑی تلاش سے ملتے تھے جو روسی زبان میں ترجمہ کیا ہوا ہمارا لٹریچر قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔

عالمِ اسلام میں یہ بیداری اچانک بلا سبب وجود میں نہیں آگئی۔ اس کی پُشت پر اسلامی تحریکوں کی طویل جدوجہد کارفرما ہے۔ خود اپنے معاشرہ میں اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس بیداری میں ہمیں اسلامی تحریکوں کے دوش بدوش چلنا ہے۔

---

اپنے معاشرہ میں ہمارا اصل ہدف کیا ہے؟ مولانا مودودیؒ کے ارشاد کے مطابق "انقلابِ قیادت کی جدوجہد، یعنی "سیاست" کوئی عارضہ نہ تھا جو جماعتِ اسلامی کو قیامِ پاکستان کے بعد کسی وقت یکایک لاحق ہو گیا۔۔۔۔ میں بلا خوفِ تردید یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ دراصل یہی وہ امتیازی وصف ہے جو زمانہ قریب کی تاریخ میں، کم از کم برِعظیم ہند کی حد تک، جماعتِ اسلامی کی تحریک کو دوسری تحریکوں سے ممیز کرتا ہے۔" (آئندہ لائحہ عمل، ص ۸۵۔ ۸۶) دعوت ہو یا تنظیم، تربیت ہو یا اصلاح معاشرہ "یہ سارے کام کرنے کا فائدہ کیا ہے اگر آپ ان کاموں سے حاصل ہونے والے نتائج کو اصل مقصد کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے ساتھ ساتھ استعمال نہ کرتے چلے جائیں۔" (آئندہ لائحہ عمل، ص ۷۰)

آپ خود سوچیے کہ اگر یہ ہدف آئینی و جمہوری ذرائع سے حاصل ہونا ہے، انتخابات کے ذریعہ ہونا ہے تو وسیع پیمانے پر رائے عامہ کو اپنے ساتھ لینے کے علاوہ مقصد تک پہنچنے کا راستہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ چنانچہ پاکستان کے قیام کے بعد ہی وہ عوامی تحریک برپا کرنے کی کوشش شروع کر دی گئی، جو اس سے پہلے مدھم اور سُست مگر مستحکم توسیع کے کام کی خاطر مؤخر کی جا رہی تھی۔ اب ہمیں اس تحریک کو آگے ہی بڑھانا ہے۔ پیچھے دیکھنے یا پلٹنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ انقلاب کے لیے ہر زمانے میں ذرائع اور مواقع اور حالات کے لحاظ سے مسلسل جدوجہد کی جاتی رہی ہے۔ آج کے حالات کے لحاظ سے بھی ماضی کے ورثہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، اسی جدوجہد کو ہمیں آگے بڑھانا ہے۔

اس مقصد کے لیے ہمیں لٹریچر، تقریر، تعلیم، زبانی گفتگو، جلسے، جلوس، ریلی، نمائش، کیسٹ، ویڈیو، میلے، بازار، گویا تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر کام کرنا ہے۔ عوام کو اسلامی نظام کی

حمایت میں ایک ایسی منظم قوت بنا دیتا ہے "جو دفاع اور ہجوم دونوں کا بل بوتا رکھتی ہو۔" اس مقصد کے لیے ہمیں زندگی کے بھڑکتے ہوئے مسائل و معاملات میں دخل دینا ہو گا' اور مخالف تحریکوں اور طاقتوں کے ساتھ زور آزمائی بھی کرنا ہوگی۔ اگر ہم نے ان مسائل میں دخل دینے اور مخالفین کے ساتھ زور آزمائی کرنے سے گریز کیا تو مطلوبہ تغیر کی رفتار بہت سست رہے گی۔

یہ عوامی تحریک خوُد ایک دعوتی کام ہے۔ بعض لوگ دعوت کا کام صرف وہ شمار کرتے ہیں جس پر دعوت کا عنوان لگا ہو۔ وہ کام جن پر سیاست یا عوامی تحریک کا عنوان چسپاں ہو' وہ اسے سیاسی ہڑبونگ کے خانے میں ڈال دیتے ہیں۔ اور یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اس عنوان کے تحت دعوت کا بھی کوئی کام ہوا ہے۔ مگر مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں' "آپ ہزار کتابیں لکھ کر [یا پڑھ کر] بھی اتنا کام نہیں کر سکتے جتنا اس صورت میں کر سکتے ہیں کہ جس وقت کوئی اہم مسئلہ لوگوں کے سامنے درپیش ہو اس وقت میدان میں آکر اس مسئلے میں ان کو صحیح رہنمائی دیں۔" (آئندہ لائحہ عمل' ص ۱۲۷-۱۲۸)

ملک کے اندر تحریک کو آج جو بہت بڑا چیلنج درپیش ہے وہ مولانا مودودیؒ کے درج بالا ارشاد کے دوسرے حصّہ سے متعلق ہے۔ یعنی یہ کہ' پاکستان بننے کے بعد ہم نے ایک مسلم معاشرہ کے عوام میں تحریک برپا کرکے جس حد تک کام کر لیا ہے' اب اس کو کس طرح آگے بڑھائیں کہ اپنی اصل منزل تک پہنچ سکیں؟ دوسرے الفاظ میں' ۵۰ سال کی کاشت کاری کے ذریعہ ہم نے ہزاروں انسانوں کی جو فصل تیار کی ہے' اور جس کا عشر عشیر بھی ابھی اصل مقصد کے لیے کام نہیں آرہا' اس کو کام میں لگا کر اس مسلم معاشرہ کی معتدبہ تعداد کو کس طرح انقلابِ امامت کے مقصد کے لیے متحرک کر دیا جائے۔

۱۹۵۷ کے لائحہ عمل کا ایک حصّہ یہ بھی رہا ہے کہ "ہمارے معاشرہ میں جو ایک بچا کھچا صالح عنصر موجود ہے' مگر منتشر ہونے کی وجہ سے یا جزوی اصلاح کی پراگندہ کوشش کرنے کی وجہ سے کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کر رہا ہے' اسے چھانٹ چھانٹ کر ایک مرکز پر جمع کیا جائے' اور ایک حکیمانہ پروگرام کے مطابق اس کو اصلاح و تعمیر کی منظم سعی میں لگا دیا جائے۔" اور اب تو اس صالح عنصر میں خوُد ہمارے وابستگان کی ایک کثیر تعداد بھی شامل ہے۔ حلقہ متفقین کا پروگرام اسی غرض کے لیے تھا' لیکن تقریباً ۳۵ سال میں بھی وہ قابلِ ذکر حد تک عملی جامہ نہیں پہن سکا۔ اب مرکزی مجلسِ شوریٰ کی طے کردہ پاسبان کی اسکیم بھی بعینہٖ اسی مقصد کے لیے شروع کی گئی ہے۔ ہمیں اس اسکیم کو کامیاب بنانے کی پوری کوشش کرنا ہے۔

عوامی تحریک کا ایک اہم جز عورتوں کا حلقہ ہے۔ وہ ہماری آبادی کا نصف حصہ ہیں۔ عورتوں کی راہ سے بگاڑ بھی تیزی سے آرہا ہے۔ انہی کے ذریعہ اصلاح کی رفتار بھی تیز تر ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے لیے ہم کو ایک ہی لگے بندھے طریقے سے کام کرنے کے بجائے حالات کے لحاظ سے موزوں تدابیر وضع کرنا ہوں گی۔

یہ سارا کام جماعت کی تنظیم میں محبت و الفت، سمع و طاعت' اور مشاورت و احتساب کے نظام کا متقاضی ہے۔ تمسخر، تنابز بالالقاب، بدظنی، تجسس، غیبت، ہمز لمز، بلا تحقیق نقل وغیرہ رذائل سے پاک ہو کر چلنا ہو گا۔ ایک دوسرے کے لیے عزت، احترام، محبت، الفت اور ذکرِ خیر کی صفات کو پروان چڑھانا ہو گا۔ خدا کا شکر ہے کہ جماعت میں اطاعت، شورائیت اور احتساب کا نظام اپنا کام کر رہا ہے۔ لیکن ان اخلاقی فضائل و رذائل کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

---

تحریکِ اسلامی کے چار نکاتی لائحہ عمل کا یہ فطری تقاضا ہے کہ جوں جوں عوام ہمارے ساتھ آئیں گے، اور ہم انقلابِ قیادت کی منزل کے قریب پہنچیں گے، اس کی گھما گھمی میں اضافہ ہو گا۔ ہمیں عوامی پذیرائی حاصل ہو گی تو مسائل پیدا ہوں گے۔ ہمارے مستحکم تو سیعی اور تربیتی کام کو اس گھما گھمی سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن اس گھما گھمی سے گھبرانا بھی نہیں چاہیے، کیونکہ ابتدا ہی سے ہم نے ان کے درمیان توازن پیدا کر کے چلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس لیے ہم پوری دلجمعی سے دعوت الی اللہ کا کام کریں، عوام کو ساتھ لائیں، جو لوگ قریب آئیں ان کی وسیع پیمانہ پر دینی اور اخلاقی تربیت کا انتظام کریں، اور انہیں منظم کریں۔ پھر اس پوری قوت کو اصلاحِ معاشرہ کے کام پر لگا دیں، اور عوامی بیداری پیدا کر کے انقلابِ قیادت کا راستہ ہموار کریں۔ ایک کام کی وجہ سے دوسرا کام ترک نہ کریں۔ کاموں میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، تقسیمِ کار ہو سکتی ہے، دوسرے تنظیمی ڈھانچے بن سکتے ہیں، لیکن لائحہ عمل کے کسی جز کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ایسا ہونا چاہیے، نہ یہ غلط مفروضہ قائم کرنا چاہیے کہ اگر عوامی کام ہو رہا ہے تو اس کے متوازی تعمیری مساعی کو ترک کیا جا چکا ہے۔

الحمدللہ ہم پچاس سال سے اس طریقِ کار کے مطابق اپنی منزل کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں۔ منزل جوں جوں قریب آتی ہے، شوقِ منزل بڑھتا ہے اور رفتار میں اضافہ ہوتا ہے۔

تیز تر گام زن منزلِ ما دور نیست

# حکمتِ سیّد مودودیؒ

## قربانی عید الاضحیٰ کی شرعی حیثیت

سب سے بڑا ثبوت اس کے سنّت اور مشروع ہونے کا یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے لے کر آج تک مسلمانوں کی ہر نسل کے بعد دوسری نسل اس پر عمل کرتی چلی آ رہی ہے۔ دو چار یا دس پانچ آدمیوں نے نہیں بلکہ ہر پُشت کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں نے اپنے سے پہلی پُشت کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں سے اس طریقے کو اخذ کیا ہے اور اپنے سے بعد والی پُشت کے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں تک اسے پہنچایا ہے۔ اگر تاریخ اسلام کے کسی مرحلے پر کسی نے اس کو ایجاد کر کے دین میں شامل کرنے کی کوشش کی ہوتی تو کس طرح ممکن تھا کہ تمام مسلمان بالاتفاق اس کو قبول کر لیتے اور کہیں کوئی بھی اس کے خلاف لب کشائی نہ کرتا؟ اور کس طرح یہ بات تاریخ میں چھپی رہ سکتی تھی کہ اس طریقہ کو کب کس نے کہاں ایجاد کیا؟ آخر یہ امّت ساری کی ساری منافقوں پر ہی تو مشتمل نہیں رہی ہے کہ حدیثوں پر حدیثیں قربانی کی مشروعیت پر گھڑ دی جائیں اور ایک نیا طریقہ ایجاد کر کے رسولِ خدا کی طرف منسوب کر دیا جائے اور پوری امّت آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر بیٹھے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ہماری پچھلی نسلیں ایسی ہی منافق تھیں تو معاملہ قربانی تک کب محدود رہتا ہے۔ پھر تو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، بلکہ خود رسالتِ محمدیہ اور قرآن تک سب ہی کچھ مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

(قربانی کی شرعی حیثیت، ص ۱۳)

# رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم بحیثیت شارع

جناب نور الٰہی صاحب - ایڈووکیٹ، گجرات

(۳)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اپنی تفسیر میں دوسری آیت کے حاشیہ پر تحریر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت احکامِ شریعت کی طرف ہے اور صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ حیاتِ ابدی اور زندگی جاودانی بخشنے والی چیز یہی نظامِ دین ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جہاد مراد ہے۔ یہ بات لحاظ رکھنے والی ہے کہ قرآن میں ایسے موقعوں پر رسول اللہ کا ذکر بجائے اسم ذات کے ہمیشہ "رسول" یا "الرسول" ہی سے آتا ہے۔ یہ آپؐ کی حیثیتِ رسالت کو نمایاں کرنے کے لیے ہے کہ آپؐ کا بُلانا فرستادۂ الٰہی کی حیثیت سے اللہ ہی کا بُلانا ہے۔

تیسری آیت میں افعال یَاْمُرُ، یَنْهٰی، یُحِلُّ اور یُحَرِّمُ۔ کا فاعل الرسول، النبی، الامی ہے۔ یعنی امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تحلیل طیّبات اور تحریم خبائث رسول کے افعال ہیں اور اس نصِ قرآنی کی کوئی دوسری تاویل نہیں کی جا سکتی۔ مولانا مودودی مرحوم نے ماہنامہ ترجمان القرآن (منصبِ رسالت نمبر) کے صفحہ ۶ پر اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

"اس آیت کے الفاظ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریعی اختیارات عطا کئے ہیں۔ اللہ کی طرف سے

امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال یا حرام قرار دیا ہے اور جس کا حضورؐ نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے، اس لیے کہ وہ بھی قانونِ خداوندی کا ایک حصّہ ہے۔"

سورۃ النجم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا گیا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ٥ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ٥

(آیت - ۳ - ۴)

ترجمہ:- وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتا (اس کا کلام تو) وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اِس آیت کے حاشیہ پر مولانا اشرف علی تھانوی اور تفسیر "معالم التنزیل" کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

یہ وحی خواہ لفظی ہو جو قرآن کہلاتی ہے، خواہ محض معنوی ہو، جو سنّت کہلاتی ہے اور خواہ محض کسی قاعدہ کلی کی ہو جس سے آپؐ اجتہاد کرتے ہوں ــــ مقصودِ زعمِ کفار کی نفی ہے۔ یعنی صرف اس حقیقت کا اظہار کہ آپؐ کسی غلط بات کی نسبت حق تعالیٰ کی جانب نہیں کر دیتے (تھانوی)

هُوَ یعنی دین کے باب میں آپؐ کا تکلم۔ ای ما نطقہ فی الدین (معالم التنزیل)

فتنۂ انکارِ سنّت کے بارے میں آنحضرتؐ کی پیشین گوئی مندرجہ ذیل حدیث میں بیان کی گئی:

عن المقدام بن معد یکرب قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ

---

۱؎ سنّت و حدیث اور ان کی تشریعی حیثیت از سید محمد متین ہاشمی نقوش رسول نمبر جلد ۶ ص ۲۶۶ -

الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول: علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ وان ما حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما حرم اللہ۔ (مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ ابوداؤد، دارمی، ابن ماجہ)

ترجمہ:۔ مقدام بن معدیکرب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سُن لو! مجھے قرآن مجید دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل (حدیث)۔ عنقریب ایک پیٹ بھرا آدمی اپنے نرم بستر پر بیٹھا کہے گا: تمہارے اوپر بس یہی قرآن لازم ہے۔ اس میں جو چیز حلال پاؤ اُسے حلال سمجھو اور جو حرام پاؤ اُسے حرام سمجھو۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی (بعض چیزوں کو) حرام قرار دیا ہے اور وہ اسی طرح حرام ہیں جس طرح وہ چیزیں حرام ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔"

اس حدیث کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغۃ کے بابِ احکامِ الدین من التحریف میں نقل کیا ہے۔ وہ دین میں تحریف وتہاون کے اسباب کے تحت لکھتے ہیں:

منہا عدم تحمل الروایۃ عن صاحب الملۃ والعمل بہ وھو قولہ صلی اللہ علیہ وسلم: الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول: علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ وان ما حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما حرم اللہ۔

ترجمہ: ازاں جملہ صاحبِ ملت سے مذہبی امور کا نقل نہ کرنا اور ان پر عمل نہ کرنا ہے۔ آنحضرتؐ کی اس حدیث میں یہی مراد ہے: ہوشیار رہو جاؤ۔ عنقریب ایسا ہو گا کہ پیٹ بھرا آدمی اپنی مسند پر بیٹھ کر کہے گا کہ اس قرآن کو

مضبوطی سے لو، پس جو چیزیں تم قرآن میں حلال پاؤ اُن کو حلال سمجھو اور جو حرام پاؤ ان کو حرام سمجھو۔ حالانکہ جو شے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کی ہے وہ ایسی ہی حرام ہے، جیسی اللہ تعالیٰ نے حرام کی ہے[1]۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعی حکمت کے بارے میں یہ جاننا ضروری ہے کہ آپؐ کی بعثت کے وقت اہلِ عرب میں شرک و بت پرستی کا رواج تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو بھول چکے تھے۔ توہم پرستی نے انہیں اس حد تک گرا دیا تھا کہ وہ پتھروں، درختوں، چاند، سورج وغیرہ تک کو معبود سمجھنے لگ گئے تھے اور ان کے ہاں انسانیت کا احترام مفقود ہو چکا تھا۔ قتلِ انسان، رہزنی، شراب نوشی، جوا، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنا، عورتوں کا اغوا جیسی برائیاں ان کا شب و روز کا معمول تھا اور وہ انسانی حقوق کے قوانین و ضوابط سے ناآشنا تھے۔ وہ کسی باقاعدہ حکومت کے ماتحت زندگی بسر کرنے اور کسی قانونی نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے۔ اس لیے تشریعی حکمت اس امر کی مقتضی تھی کہ اسلامی شریعت دفعتاً نافذ نہ کر دی جائے۔ بلکہ لوگوں کو رفتہ رفتہ قوانین کی پاسداری کا خوگر بنایا جائے اور ان کی عملی زندگی کو قانون کا کاربند بنا دیا جائے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی وحی کے مطابق شریعت کو آہستہ آہستہ تدریج مناسب ترتیب کے ساتھ نافذ فرمایا اور تیئیس ۲۳ سال کی مختصر مدت میں طہارتِ جسم و لباس سے لے کر صلح و جنگ اور بین الاقوامی معاملات تک زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی شریعت کو جاری کر دیا۔

---

[1] اردو ترجمہ ــ از مولانا عبدالحق حقانی، جلد اول ص ۳۶۰ مطبوعہ اصح المطابع کراچی۔

# امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

## افادات امام ابن تیمیہؒ

تلخیص، تہذیب، ترتیب ۔ حکیم شریف احسن صاحب

(۲)

حکمرانوں سے لڑنے کا معاملہ اسی عام قاعدے میں داخل ہے کہ جب مصالح اور مفاسد اور حسنات اور سیئات باہم متصادم اور ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں تو جس طرف وزن زیادہ ہو اُسے ترجیح دی جائے کیونکہ ہر امر و نہی بناؤ (مصلحت) کی کسی نہ کسی صورت کے حصول اور بگاڑ (مفسدہ) کی کسی نہ کسی شکل کے دفعیہ کی متضمن ہوتی ہے۔ لہٰذا اقدام سے پہلے یہ ضرور دیکھ لیا جائے کہ کس چیز کا کس چیز سے تصادم اور ٹکراؤ ہے۔ اگر اس سے فوت ہونے والے مصالح (بناؤ کی صورتیں) اور حاصل ہونے والے مفاسد (بگاڑ کی صورتیں) زیادہ ہوں تو حسبِ موقع امر و نہی پر انسان نہ صرف یہ کہ مامور نہیں ہوگا بلکہ صلاح سے زیادہ فساد کا موجب بننے کی صورت میں اس کے لیے ایسا کرنا حرام ہوگا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ فیصلہ مصالح اور مفاسد میں سے کس کا کتنا وزن ہے۔ شریعت کے ترازو پر ہوگا۔

اسی متذکرہ بالا اصول کے تحت ایسے شخص یا گروہ اشخاص کو معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا جائز نہیں ہوگا۔ جن میں معروف و منکر اس طرح ہوں کہ وہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ اور صورت یہ ہو کہ یا تو وہ دونوں کو ایک ساتھ کریں گے یا دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اس حالت میں دیکھنا ہوگا کہ اگر معروف

کرنا شروع کر دیا۔

دیکھیے سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۸۵:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ۔

رسول اس ہدایت پر ایمان لائے جو ان کے رب کی طرف سے نازل ہوئی اور اہلِ ایمان بھی، یہ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر۔ ان کا اقرار ہے کہ ہم اللہ تعالےٰ کے رسولوں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔

ایک دوسری آیت میں اسی بات کو اس طرح واضح کیا گیا ہے:

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

(البقرہ ۔ ۱۳۶)

(اے مسلمانو)، کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور اُس ہدایت پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل کی گئی، اور اُس پر بھی جو حضرت ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب علیہم السلام اور اُن کی اولاد پر نازل ہوئی، اور اس چیز پر بھی ایمان لاتے ہیں جو دیگر انبیاء علیہم السلام پر اُن کے رب کی جانب سے نازل کی گئی۔ ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے، ہم تو صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔

یہ اور دیگر متعدد آیات اس بات کی شاہد ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نئے عقائد پیش نہیں کیے، بلکہ انہی عقاید کی تصدیق کی، جن کی تعلیم قدیم آسمانی کتابوں نے دی تھی اور جن کی تعلیم سابقہ انبیاء نے اپنی اپنی قوموں کو دی تھی، لیکن امتدادِ زمانہ اور عوام الناس

کا شکار ہو جاتی۔ اور یہ سن کر کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں، لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام سے متنفر ہو جاتے۔ اس کا کچھ اندازہ قصہ افک سے کیا جا سکتا ہے۔ جب حضورؐ نے داستانِ افک کے بارے میں لوگوں سے خطاب کیا اور ان سے اس مہم کے سرغنہ کے خلاف مدد چاہی اور حضرت سعد بن معاذ نے نہایت اچھے الفاظ میں اس پر لبیک کہی تو حضرت سعد بن عبادہ اپنے حسنِ ایمان کے باوجود، حضرت سعد بن معاذ کی بات پر مشتعل ہو کر اس سرغنہ منافقین کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔[1]

اس مسئلہ میں ایک اور اہم اصول جس کا پیشِ نظر رہنا ضروری ہے یہ ہے کہ انسان کی معروف سے محبت اور اس کی چاہت اور منکر سے دشمنی اور نفرت اللہ تعالیٰ کی محبت و عداوت اور شریعت کے تابع ہونی چاہیے۔ بعض لوگ اس سلسلہ میں خدا ورسول کے مقرر کردہ پیمانوں کے بجائے چاہت اور کراہت کے خودساختہ پیمانوں سے کام لیتے ہیں یہ اتباع ہوا یعنی خواہشِ نفس کی پیروی ہے اور اس سے بڑی کوئی گمراہی نہیں۔ قرآن میں ہے ––"اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو خدائی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کرے"۔ (القصص –– ۵۰)۔ خدا ورسولؐ کا حکم معلوم کیے بغیر یا اس سے پیشتر محبت و عداوت کے اظہار کی بھی یہی نوعیت ہے۔ یہ تو ایک گونہ تقدم بین یدی اللہ ورسولہ –– یعنی خدا ورسول کے پیچھے چلنے کے بجائے آگے چلنا ہے، جس کی قرآن میں سخت ممانعت آئی ہے۔ (الحجرات: ۱)

علاوہ ازیں محبت و نفرت کے جوش میں یہ نہیں بھولنا چاہیے، اس کا کچھ ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ پسندیدہ کام کے کرنے اور ناپسندیدہ فعل کے روکنے میں اپنی قوت اور استطاعت کا خیال رکھا جائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی قوت سے زیادہ کا

---

[1] حضرت سعد بن معاذ کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا اور حضرت سعد بن عبادہ قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ عبداللہ بن ابی کا قبیلہ بھی خزرج تھا۔

مکلف نہیں کرتا۔ خود اس کا ارشاد ہے:
فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ۔ (تغابن-۱۶) "یعنی جہاں تک تمہارے بس میں ہو، اللہ سے ڈرتے رہو"۔ البتہ یہاں تک قلبی محبت وعداوت کا تعلق ہے اس کا کامل اور قطعی ہونا ضروری ہے۔ اس کی کمی ایمان کی کمی کی دلیل ہوگی۔ رہا فعلِ بدن تو یہ صرف طاقت کی حد تک واجب ہے۔ حب قلب کی بہ تمام وکمال چاہت اور کراہت کے ساتھ حسب استطاعت بدن کا فعل بھی شامل ہو جائے گا۔ تو بارگاہِ ربانی سے اس شخص کو فاعل کامل کا ثواب عطا کر دیا جائے گا۔

امر و نہی کے سلسلہ میں اہم اور کم اہم اور موقع ومحل کا لحاظ بھی ضروری ہے حضرت عائشہ فرماتی ہیں: "سب سے پہلے مفصل میں سے ایک سورت نازل ہوئی جس میں جنت اور دوزخ کا ذکر تھا۔ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے تو حلال وحرام کے احکام کا نزول شروع ہو گیا۔ اگر نزولِ وحی کا آغاز اس حکم سے ہوتا کہ شراب مت پیو تو لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے اگر ابتدائے وحی میں کہا جاتا کہ زنا مت کرو تو لوگ کہتے ہم زنا کبھی نہیں چھوڑیں گے"۔ حضرت عائشہ کا یہ ارشاد بالکل درست ہے۔ ابتدائی دور میں وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں توحید، آخرت اور وعدہ وعید کا ذکر ہے۔ مکہ سے ہجرت کر کے جب حضورؐ اور آپؐ کے صحابہ مدینہ تشریف لے گئے، ایک اسلامی معاشرہ وجود میں آ گیا۔ اور نظمِ حکومت قائم ہو گیا تو بقرہ اور نساء وغیرہ سورتوں کا نزول ہوا، جو احکام پر مشتمل ہیں۔ یہی حکمت کا تقاضا تھا۔ توحید، رسالت اور آخرت پر جب ایمان راسخ ہو گیا تو مشکل سے مشکل حکم کی تعمیل میں لوگوں کو کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور ان کی خاطر جہاد میں انسان کو بعض اوقات سخت دشواریوں اور آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان سے بچنے کے لیے مختلف لوگ مختلف بہانے تراشتے ہیں۔ دورِ رسالت میں بھی اس طرح کے واقعات پیش آئے۔ غزوۂ تبوک میں شرکت سے ایک شخص نے حضورؐ سے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ عورت

اس کی کمزوری ہے اور رومیوں کی عورتیں خوب صورت ہوتی ہیں مجھے رخصت دیں اور فتنہ میں نہ ڈالیں۔ (ائذن لی ولا تفتنی ۔ التوبہ ۔ ۴۹
اس پہ ارشادِ الٰہی ہوا۔ الا فی الفتنۃ سقطوا یعنی فتنہ میں تو ایسے لوگ پڑ ہی گئے ۔ ظاہر ہے اس سے بڑا فتنہ کیا ہو سکتا ہے کہ نبی کی قیادت میں جانے والی اتنی اہم مہم میں شرکت سے ایک شخص محض اس لیے معذرت کردے کہ اس سے اس کو ایک بہت ہی کم درجے کے موہوم فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ قرآن تو فتنہ کا قلع قمع کی خاطر جہاد کا حکم دیتا ہے ۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ (الانفال: ۳۹) ۔ یعنی ان سے جنگ کیے جاؤ یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے ۔ اور یہ صاحب فتنہ سے بچنے کی خاطر جنگ میں شرکت سے معذرت فرما رہے ہیں۔

منکر کے سلسلے میں تین رویے ظلم و جہل کے رویئے ہیں۔ ایک رویہ ان لوگوں کا جو منکرات کے مرتکب ہوتے ہیں۔ دوسرا رویہ پہلے رویہ کو دیکھ کر چپ رہنے اور نہی کے لیے حرکت نہ کرنے والوں کا ہے۔ تیسرا رویہ ان لوگوں کا ہے جو منکر کو روکنے کے لیے حرکت میں تو آتے ہیں لیکن ایسے انداز میں جو ممنوع ہے۔ قدیم و جدید ہر دور میں اس رویہ نے عظیم ترین فتنوں اور شرور کو جنم دیا ہے۔ جو شخص بھی فتنوں کی تاریخ کا مطالعہ کرے گا وہ یہی رائے قائم کرے گا کہ اُمت کے حکمرانوں اور علماء کے مابین اور سلوک اور مشائخ و متبعینِ مشائخ کے درمیان جو فتنے برپا ہوئے ہیں ان کی جڑ یہی چیز ہے۔

ظلم و جہل کے یہ تینوں رویے گناہ کے رویے ہیں

ہر اہم کام سرانجام دینے کے لیے کچھ صلاحیتیں اور اوصاف درکار ہوتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سب سے زیادہ اہم، افضل اور احسن اعمال میں سے ہیں۔ اس سے عہدہ برآ ہونے کے بھی کچھ لوازم ہیں۔ احادیث و آثار کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس عظیم ترین عمل صالح کو کرنے کے لیے تین اوصاف ضروری ہیں۔ علم، نرمی اور صبر۔ علم امر و نہی سے پہلے، نرمی امر و نہی کے دوران، اور صبر امر و نہی کے بعد، بعض سلف

سے مروی ہے۔ جس کی روایت مرفوعاً بھی کی گئی ہے کہ صرف وہی شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے جو سوجھ بوجھ کے ساتھ امر و نہی کا علم رکھنے والا ہو۔ اس میں وہ نرمی سے کام لے اور تحمل اور برداشت کا رویہ اختیار کرسکے۔

بہت سے لوگ یہ خیال کرکے کہ ان اوصاف سے متصف ہوکر اس دشوار گزار وادی میں قدم رکھنا مشکل ہے، ان سے یہ فریضہ ساقط ہوگیا، لہٰذا وہ اسے ترک کردیتے ہیں۔ ان کا یہ رویہ بھی نقصان دہ ہے۔ کیونکہ ایک امر واجب کا چھوڑنا گناہ ہے اور ایک گناہ سے دوسرے گناہ کی طرف منتقل ہونا، ایسے ہی ہے جیسے دھوپ سے بھاگ کر آگ کے دامن میں پناہ لینا۔ یا ایک دینِ باطل کو چھوڑ کر دوسرا دینِ باطل اختیار کرنا۔ یہی کیفیت امر و نہی میں کوتاہی کے مرتکب اور حد سے متجاوز اشخاص کی ہوتی ہے[۱]۔ یہ

---

[۱] امر و نہی میں کوتاہی اور تجاوز کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ مثلاً کوتاہی کی ایک صورت یہ ہے کہ جو کام آسانی سے ممکن ہو، وہ بھی نہ کیا جائے۔ دوسری صورت یہ کہ قوت کو استطاعت سے بھی کم استعمال کیا جائے۔

تجاوز کی ایک شکل یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے کاموں پر بے ڈھب طریقہ سے زیادہ قوت استعمال کردی جائے، جیسے نعیم صاحب کی روایت کے مطابق ایک صاحب مونچھوں کو پست کرنے کا حکم دیتے ہوئے مونچھوں والے کو نائی تک لے جانے کی مہلت دیے بغیر اپنی جیب سے زیرو مشین نکال کر اس کی مونچھوں کا صفایا کردیا کرتے تھے۔

تجاوز کی دوسری شکل یہ ہے کہ وہ کام جو انسان کے بس میں نہ ہو یا قوتِ نافذہ کے بغیر ممکن نہ ہو اس کی ذمہ داری اپنے سر لے کر سربکف میدان میں اتر آئے۔ جیسے فحاشی کی روک تھام کے لیے سینماؤں میں گھس کر توڑ پھوڑ کی جائے اور سکرینوں کو پھاڑ دیا جائے۔ نتیجتاً سر پھٹول میں فائرنگ ہو۔ مقدمات قائم ہوں اور مدتوں عدالتوں میں پیشیاں بھگتائی جاتی رہیں۔ اور آخر کار جرمانوں یا قید و بند کی سزا سے دوچار ہوں۔ وقت،

(باقی بر صفحہ آئندہ)

دونوں قسم کے لوگ گنہ گار ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مقابلہ میں کبھی کم، کبھی زیادہ اور کبھی برابر۔

امر و نہی اور دعوت میں لوگوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ایک اور چیز جس کی ضرورت پڑتی ہے، احسان کا رویہ ہے۔ کیونکہ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ انسان تلخی کو صرف اسی صورت میں گوارا کرتا ہے جب اس کے ساتھ کسی قدر حلاوت بھی شامل ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تالیف قلب کا حکم دیا ہے یہاں تک کہ صدقات میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ مقرر کر دیا ہے اور اسی غرض کے لیے اپنے نبیؐ سے فرمایا ہے: خُذِ العفو وأمر بالعرف واعرض عن الجاھلین۔ "اے نبیؐ نرمی و درگزر کا شیوہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو۔" (الاعراف-۱۹۹)

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

قوت اور مال کے ساتھ اس سارے "جہاد" کے باوجود فحاشی کے یہ اڈے بھی قائم رہیں اور ان سے فحاشی بھی برابر پھیلتی رہے۔ اسے خسران مبین نہ بھی کہیں تو اس میں کیا شک ہے کہ حکومت یا ایسی قوت کے بغیر جو حکومت کو بھی شل کر کے رکھ دے، اس طرح کے اقدام کا شمار حد سے تجاوز میں ہوگا۔

# علم و علمائے دین اور اسلامی تحریکیں

جناب منیر احمد خلیلی صاحب

عالمی اسلامی تحریکوں میں شامل افراد کا ایک سرسری سا جائزہ یہ حقیقت ہمارے سامنے کھول کر رکھتا ہے کہ ان کی دعوت اور پروگرام سے اتفاق کرنے والے لوگوں میں اعلیٰ اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کا تناسب غالب ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء اور طالبات، وکلاء اور اساتذہ، ڈاکٹرز اور انجینئرز اور سرکاری ملازمین کے مختلف درجوں کے لوگ ان تحریکوں میں نہ صرف ایجابی انداز کی دلچسپی رکھتے ہیں، بلکہ ان کی کامیابی کے متمنی اور اپنے اپنے دائرے میں اس کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ ایک اعتبار سے ان تحریکوں کے لیے باعثِ فخر اور قابلِ اطمینان امر ہے۔ پڑھا لکھا اور صاحب الرائے اور صائب الرائے طبقہ جس بھی تنظیم یا تحریک کا حامی ہو، اس کا کام بہت آسان اور منزل بہت قریب آجاتی ہے۔ اس لیے کہ اس طبقہ کو ایک تو جدید معاشرہ میں اثر و نفوذ حاصل ہے، دوسرے کلیدی سطحوں پر اس طبقے کا گہرا عمل دخل ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کی وابستگی سے یہ چیز بھی عیاں ہوتی ہے کہ ان دینی تحریکوں کی دعوت فہم و شعورِ انسانی کو اپیل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس دعوت میں نہ تو کوئی ما فوق الفطرت اور ما فوق الذہن عنصر ہے، جس تک انسانی شعور اور فراست کی رسائی نہ ہو سکے، نہ ہی یہ دعوت ایسی فرسودہ اور از حقائق رفتہ قسم کی ہے جسے عام درجہ کی سوچ اور سمجھ میں بھی بار نہ مل سکے۔

بدقسمتی یہ رہی ہے کہ صدیوں پر محیط عرصے سے دین و دنیا کی تقسیم کا باطل تصور آج بھی مائج الوقت سکّے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج بھی زندگی میں ایسی لکیریں کھنچی ہوئی ہیں جو دُنیاوی اُمور اور دینی معاملات کی حدود کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اپنی دیندارانہ زندگی، اسلام سے محبت اور عملی تعلق کے باوجود جن جدید اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقوں کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے وہ دُنیاداری کے زُمرے میں آتے ہیں۔ وہ جس زیورِ تعلیم سے آراستہ ہیں وہ تعلیم فی الواقع مادی تقاضوں کی تکمیل اور دُنیاوی اُمورِ زندگی ہی سے بحث کرتی ہے۔ وہ تعلیم اپنی پُشت پر جس اکتسابی ماحول اور طریقِ کار کا پس منظر رکھتی ہے وہ بھی سر بسر مادی اور غیر دینی ہے، چنانچہ غیر شعوری طور پر اس تعلیم یافتہ طبقے میں بھی اپنی تعلیم پر تفاخر اور دینی تعلیم کے بارے میں استخفاف اور سبک فکری کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دینی تعلیم حاصل کرنے اور دینی مدارس کی چٹائیوں پر بیٹھنے والے مدارس عربیہ کے طلبا اور ان کے دراز ریش، دلق پوش اور فقیر منش اساتذہ کے بارے میں دنیوی تعلیم سے مزین حضرات کے دل میں جو جذبہ پھوٹتا ہے وہ احترام و توقیر کے بجائے ترس اور ترحّم کا جذبہ ہوتا ہے۔ دین کی تعلیم پانے اور دینے والوں کی سعادت کا احساس کرنے کے بجائے ان کی بے چارگی کا خیال زیادہ ستاتا ہے۔ تہذیبِ مغرب کے تسلّط اور غلبے کے باعث دینی تعلیم کے اشغال ضیاعِ وقت اور نکبت و عسرت، بدحالی و پس ماندگی کمانے کے مترادف نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غلبۂ دین اور فروغِ دعوتِ اسلام کے متمنی اور اسلامی تحریک میں ہمہ تن سرگرم لوگوں میں سے بھی ایک بہت بڑی اکثریت اپنے بچوں کو دینی تعلیم میں مہارت حاصل کرنے پر لگانے کے بجائے انھیں ڈاکٹر، انجینئر، قانون دان، کاروباری اور اعلیٰ سول یا فوجی افسر کے روپ میں دیکھنے کی خواہاں ہوتی ہے۔ کیونکہ دُنیاوی عزت و وجاہت اور جاہ و مال اور فارغ البالی اور خوش حالی کی منزل تک جانے والے تمام راستے ان مراتب و مناصب سے ہو کر جاتے ہیں۔

ہمارا اس بات پر اصرار ہرگز نہیں ہے کہ خیر و صلاح، نیکی اور بھلائی اور ایثار و

اخلاص کا مادہ جدید تعلیم یافتہ حضرات میں سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ضروری نہیں سمجھتے کہ دینی علوم کے تمام ماہرین اور علما ان اوصاف کے ضرور حامل ہوتے ہیں۔ جدید تعلیم سے بلاشبہ نگاہ میں وسعت، فہم میں پختگی، مسائل و معاملات کا شعور، اور دورِ حاضر کے تقاضوں کی سوجھ بوجھ حاصل ہوتی ہے۔ روشن خیالی اور بلند نظری بھی انسان میں یہ تعلیم پیدا کرتی ہے، لیکن یہ حقیقت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ جدید مادی علوم دل کا کشود، رُوح کی بالیدگی، نفس کا تزکیہ، سیرت و کردار کی تعمیر اور ملی اور دینی تقاضوں کے مطابق شخصیت سازی کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یہ کائنات کے بارے میں معلومات کو وسیع کرتے ہیں، لیکن کائنات کے خالق کے ساتھ عبدیت کے احساس سے سرشار تعلق گھٹ جاتا ہے۔ ان سے دماغ میں تنوع اور عصری افکار و نظریات کے رفیع اور پُرشکوہ قصر تو تعمیر ہوتے ہیں، لیکن قلب اُجاڑ اور سینہ ویران ہو جاتا ہے۔ تن اُجلے اور من میلے ہو جاتے ہیں۔ بیرون روشن اور اندرون تاریک ہو جاتا ہے۔ یہ علوم جس ماحول میں دیتے جاتے ہیں اور ان میں جو سانچا بنا ہوا ہے، اُس ماحول سے نکلنے اور اُس سانچے میں ڈھلنے والے افراد خدا پرستی سے زیادہ خود پرستی پر مائل ہو جاتے ہیں۔ خوفِ خدا، فکرِ آخرت، حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، دینی غیرت کے بیج اُگنے اور بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے یہ ماحول سازگار ہوتا ہی نہیں۔

**جدید تعلیم یافتگان کو علومِ دین سے مزین کرنے کا اہتمام ہونا چاہیے**

ہم یہ نہیں کہیں گے کہ دینی تنظیموں اور تحریکوں میں جدید تعلیم یافتہ عنصر کو کم اہم جان کر نظر انداز کیا جائے یا انھیں اپنی صفوں میں سرے سے جگہ نہ دی جائے یا ان سے کام نہ لیا جائے۔ یہ عنصر ان تحریکوں کے پاس ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ ہم جو حقیقت اسلامی تحریکوں کے کارپردازان کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ دینی علم اور علمائے دین کی اہمیت کو ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے۔ انھیں توقیر و فضیلت کا مستحق تصور کیا جائے۔ اور ان کے دینی علم اور بصیرت سے پورا پورا استفادہ کیا جائے۔ وہ بڑی اکثریت جو تعلیمِ دین سے بے بہرہ ہے۔ اُس کو دینی علم دینے کے لیے تنظیموں اور تحریکوں کے اندر ایسا تنظام وضع کیا جائے

جس کے نتیجے میں تحریک کا ہر کارکن عالم نہ بن سکے تو کم از کم شوق و لگن کے ساتھ علوم دین کا طالب علم نظر آنے لگے۔ اِن تحریکوں کے اندر کی فضا مجموعی طور پر دیندارانہ فضا بن جائے۔ قال اللہ اور قال الرسول کے حوالے سے باتیں زیادہ ہونے لگیں اور جدید تقاضوں کو نباہتے ہوئے یہ تحریکیں صحیح معنوں میں دینی اور اسلامی روح سے سرشار ہوجائیں۔ ان پر مادیت کا تیزی سے چڑھتا ہوا زنگ اُتر جائے۔ اور رجحانات اور میلانات ظاہری اور مادی و سیاسی نتائج سے زیادہ اُخروی نتائج کی طرف ہوجائیں۔

## علمِ حقیقی سے خوفِ خدا اور تعلق باللہ پیدا ہوتا ہے

قرآن و سنّت کے مطالعے سے ہمیں علم اور علماء کی عظمت و فضیلت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ یہ پتہ چلتا ہے کہ فکرِ آخرت اور خوفِ خدا اسی علمِ دین سے سینوں کو منوّر رکھنے والے علمائے حق کے دلوں میں پایا جاتا ہے۔ اِس حقیقت کو قرآن نے اِن الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط۔ "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں" (فاطر۔ ۲۸) مولانا مودودیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں بتایا ہے کہ علماء سے یہاں مراد فلسفہ و سائنس اور تاریخ و ریاضی وغیرہ درسی علوم کے ماہرین نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ علوم، جیسا کہ ہم نے اُوپر واضح کیا ہے کہ آدمی کو خدا شناس نہیں بناتے۔ علماء سے مراد وہی علومِ دین کے حامل لوگ ہیں جنہوں نے اسرارِ ربانی سے آگاہی حاصل کی، جو صفات و اختیارات اور حقوقِ خداوندی کے پہچاننے اور جاننے کے قابل ہوئے، جنہیں اللہ کی قدرت اور قوت، اس کے علم و حکمت اور اُس کی قہاری و جباری کی معرفت حاصل ہوگئی۔ جس کو یہ معرفت اور پہچان جتنی زیادہ ہوگی اُس کے دل میں اسی قدر اللہ کا خوف بڑھے گا، تعلق باللہ میں اضافہ ہوگا، اطاعت کی روش پختہ ہوگی۔ اُسے اپنے مقصود و مطلوب کی طرف سفر کرنے میں اعتماد، شرحِ صدر اور اطمینان و مسرّت ملے گی۔ مقصود جتنا بلند اور مطلوب جتنا عظیم ہوگا، اُس کی راہ میں قربانی کا جذبہ اور جہد و کاوش کا شوق اسی قدر فراواں ہوگا۔ خلوص اور بے ریائی، بے لوثی اور لِلّٰہیت

کی دولت ہاتھ آئے گی۔

**علم دین نہ رکھنے** | علمِ دین نہ ہو تو خواہشاتِ نفس اور ظن وگمان کا غلبہ ہوجاتا ہے۔

والوں پر اُن کی منزل روشن نہیں ہوتی ہے۔ وہ برہان ودلیل سے محروم اور یقین سے عاری ہوتے ہیں۔ انہیں نورِ بصیرت میسّر نہیں ہوتا۔ اُن کے فیصلوں اور عملوں کی پُشت پر ایمانِ محکم اور یقینِ کامل کا سہارا نہیں ہوتا۔ معرفت وحق شناسی کے نور سے اُن کے سینے خالی ہوتے ہیں، چنانچہ انہیں اپنی جدوجہد کے لیے ظن وگمان اور تخمین وقیاس کے پیمانے استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ اُن پر خواہشاتِ نفس کی یلغار رہتی ہے تو ان کی تحریکی اور دینی سرگرمیاں بھی خواہشاتِ نفس کی لپیٹ میں آجاتی ہیں۔ قرآن وسنت کے مخصوص دلائل کے بجائے تاویلات وتوجیہات سے کام چلانے لگتے ہیں۔ تحریکی کام کا محرک بھی ان کی بعض دنیوی اغراض بن جاتی ہیں۔ اور وابستگیوں میں ذاتی اغراض یا بعض خواہشات کی تکمیل کا جذبہ داخل ہوجاتا ہے۔ ایسے لوگ اگر "داعی" بن کر لوگوں کو تحریکِ اسلامی کی دعوت دینے نکل کھڑے ہوں تو دُنیا اُن کو مسترد کرے یا قبول، تاہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دُنیا والوں کو ان کے خلاف ایک سخت تنبیہ موجود ہے۔ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ - "اُن لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو، جو علم نہیں رکھتے" (جاثیہ - ۱۸)۔

حقائق ومطالباتِ ربانی کے علم ومعرفت کے بغیر دعوتِ دین کا کام تو درکنار خود انسان کی عبادت وریاضت اور زہد وورع کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ یہ ڈر موجود رہتا ہے کہ وہ شخص جسے دُنیا زاہد وعابد کے طور پر دیکھتی اور جانتی ہے خدا کو راضی کرنے نکلے اور اپنی بے علمی اور جہالت کے سبب سے شیطان کو خوش کر کے لوٹے۔

(باقی)

# امام محمد بن حسن الشیبانیؒ

جناب عبد الرشید عراقی صاحب

امام محمد بن حسن الشیبانی فقہ حنفی کے اساطین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق دمشق کے قریب ایک گاؤں حرستا سے تھا۔ ان کے والد حسن حرستا سے ترکِ سکونت کر کے عراق کے شہر واسط آ گئے۔ جہاں امام حسن ۱۳۲ھ میں پیدا ہوئے[1]

امام محمد بن حسن سنِ رُشد کو پہنچے کہ ان کے والد حسن واسط سے کوفہ منتقل ہو گئے۔ کوفہ اس وقت علم وفن کا مرکز تھا۔ اور علماء و مشائخ کا گہوارہ تھا۔

علامہ ابن القیم (م ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں کہ:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علمِ نبوت کے تین مراکز تھے، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور کوفہ۔ مکہ معظمہ کے صدر معلم حضرت عبد اللہ بن عباس (م ۶۸ھ) اور مدینہ منورہ کے حضرت عبد اللہ بن عمر (م ۷۳ھ) اور کوفہ کے حضرت عبد اللہ بن مسعود (م ۳۲ھ) تھے۔[2]

حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب (م ۴۰ھ) نے اس شہر کو دار الخلافہ بنایا۔ اور آپ کے بیشتر فیصلے کوفہ سے صادر ہوتے تھے

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۲ ص ۱۷۲۔

[2] اعلام الموقعین جلد ۱۔

## کان اغلب قضایا بالکوفۃ [1]

"حضرت علیؓ کے بیشتر فیصلے کوفہ سے صادر ہوتے تھے"

کوفہ کو حضرت عمر بن خطاب (م ۲۳ھ) نے آباد کیا تھا۔ اور حضرت علیؓ بن ابی طالب (م ۴۰ھ) کی تشریف آوری سے پہلے علم وفن اور قرآن وسنت کا دار العلوم بن چکا تھا۔

شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) لکھتے ہیں:

ولما ذھب (علیؓ) الکوفۃ کان اھل الکوفۃ قبل ان یاتیھم قد اخذوا الدین عن سعد بن ابی وقاص وابن مسعود وحذیفۃ وعمار وابی موسٰی وغیرھم ممن ارسلہ عمر الی الکوفۃ۔ [2]

"جب حضرت علیؓ کوفہ تشریف لے گئے تو اہلِ کوفہ آپ کے وہاں آنے سے پہلے حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت حذیفہ، حضرت عمار، حضرت ابو موسٰی وغیرہ (رضی اللہ عنہم) سے جن کو حضرت عمر فاروقؓ نے کوفہ روانہ کیا تھا، دین حاصل کر چکے تھے"۔

حافظ سخاوی (م ۹۰۲ھ) لکھتے ہیں کہ کوفہ میں ایک ہزار پچاس صحابہ کرامؓ نے سکونت اختیار کی۔ جن میں ۲۴ صحابہ وہ تھے جو غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب رہے تھے [3]

**تعلیم کا آغاز** امام محمد بن حسن نے کوفہ میں تعلیم کا آغاز کیا۔ امام مسعر بن کدام (م ۱۵۵ھ) امام سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ)، امام اوزاعی (م ۱۵۷ھ) سے حدیثیں روایت کیں۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۱ ص ۱۳۲۔

[2] منہاج السنۃ النبویہ جلد ۴ ص ۱۵۷۔

[3] فتح المغیث ص ۳۸۲۔

**امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں** امام محمد بن حسن حضرت امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دو سال تک آپ کی خدمت میں رہ کر جملہ علومِ اسلامیہ تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کی۔[۱]

**امام ابو یوسفؒ کی خدمت میں** امام ابو یوسفؒ (م ۱۸۲ھ) جو امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) کے شاگرد تھے۔ اور ان کا شمار فقہ حنفی کے اجلہ ائمہ کرام میں ہوتا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ) کے عہد میں قاضی القضاۃ رہے۔ امام محمد ان کے درس میں شامل ہوئے اور فقہ کی تکمیل کی۔

**امام مالک بن انس کی خدمت میں** قرآن اور فقہ کی تعلیم امام محمد نے حضرت امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) اور حضرت امام ابو یوسفؒ (م ۱۸۲ھ) سے حاصل کی۔ اور حدیث کی تعلیم اس سے پہلے امام مسعر بن کدام (م ۱۵۵ھ)، امام سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) اور امام اوزاعیؒ (م ۱۵۷ھ) سے حاصل کر چکے تھے۔ لیکن ان کو کسی ایسے استاد کی ضرورت تھی، جو خالص حدیث کا ذوق رکھتا ہو۔ اس کے لیے امام محمد نے دربارِ نبوی کا رُخ کیا۔ اور امام مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی خدمت میں تین سال رہ کر حدیث کی تعلیم حاصل کی۔

**تکمیلِ تعلیم کے بعد** امام محمد بن حسن ۲۰ سال کی عمر میں جملہ علومِ اسلامیہ یعنی تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ میں تکمیل کے بعد درس و تدریس میں مشغول ہوئے، اور ان کے حلقۂ درس میں، کوفہ، بصرہ، شام، ہرات، رے، نیشاپور، حلب، بخارا، اور اقصائے عرب، غرض دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ سے تشنگانِ علم آکر اس سرچشمۂ علم سے سیراب ہونے لگے۔ ان کے تلامذہ کا استقصا بہت دشوار ہے۔

**امام محمد بن ادریس شافعی** امام محمد بن ادریس شافعی (م ۲۰۴ھ) جو خود ایک فقہ کے بانی ہیں۔ امام محمد بن حسن کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ ۱۸۴ھ میں امام محمد بن حسنؒ

---

[۱] مناقب امام محمد ذہبی ص ۵

کی شاگردی اختیار کی۔ اور آپ سے فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ امام محمد بن ادریس شافعیؒ (م ۲۰۴ھ) جو امام محمد بن حسن کی شاگردی میں آنے سے پہلے اجتہاد و فقہ سے پورے طور پر واقف ہو چکے تھے۔ از سر نو تحصیلِ علم میں مشغول ہوئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) لکھتے ہیں:

"امام شافعی نے فقہ عراق کو بکمال حاصل کیا۔ اور امام محمد کی خدمت میں تین سال سے زائد رہے۔ بالآخر فقہ کے بانی مؤسس قرار پائے۔"[۱]

امام شافعی نے امام محمد کی بارگاہِ فیض سے جو کچھ حاصل کیا تھا اس پر تا زندگی ممنون رہے۔

علامہ ابن خلکان (م ۶۸۱ھ) لکھتے ہیں کہ:

"امام محمد امام شافعی کا بہت خیال فرماتے تھے اور جو برتاؤ امام محمد کا امام شافعی سے تھا، وہ کسی دوسرے شاگرد کے ساتھ نہیں تھا۔"[۲]

**موطائے امام مالک کا درس** اہلِ عراق میں امام محمد پہلے شخص ہیں جنہوں نے مدینہ منورہ میں تین سال رہ کر امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) اور دوسرے ائمہ حدیث سے استفادہ کیا۔ اور ان کی مرویات کا ایک بہت بڑا سرمایہ اپنے ساتھ عراق لے گئے۔ امام مالکؒ کی مرویات کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ امام اسد بن فرات (م ۲۱۳ھ) جو حضرت امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) کے شاگرد تھے۔ فرماتے ہیں کہ:

"ایک دن ہم لوگ امام محمدؒ کے درس میں شریک تھے کہ ایک شخص مجلس میں کودتا پھاندتا تیزی سے امام محمدؒ کے پاس پہنچا اور اُس نے کچھ آہستہ سے کہا۔ ہم نے سنا کہ امام محمدؒ نے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ، پڑھا اور فرمایا کہ کتنی بڑی مصیبت ہے کہ امام مالکؒ امیر المؤمنین فی الحدیث کی وفات

---

[۱] توالی التاسیس ص ۶۹۔

[۲] تاریخ ابن خلکان جلد ۳ ص ۲۰۶۔

ہو گئی۔ اس کے بعد تمام مجلس میں ماتم برپا ہو گیا۔“ [1]

**عہدۂ قضا** اسلاف میں بہت سی ایسی ہستیاں ملیں گی، جنہوں نے اپنے فضل و کمال کے باوجود حکومت کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔ اور نہ امراء و سلاطین کی صحبت کو پسند کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بسا اوقات سلاطین اور اراکین سلطنت کے دباؤ سے ایسا کام کرنا پڑتا تھا جو ان کے ضمیر اور حمیتِ دینی کے خلاف ہوتا تھا۔ اسی اصول کے تحت حضرت امام ابو حنیفہؒ (م ۱۵۰ھ) نے خلیفہ منصور (م ۱۵۸ھ) کی طرف سے عہدہ قضا کی پیش کش مسترد کر دی۔ امام ابو یوسفؒ (م ۱۸۲ھ) نے ایک خاص مصلحت کے تحت عہدہ قضا کو قبول کیا۔ اور مصلحت یہ تھی کہ اس عہدۂ قضاء کے ذریعہ امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) کے مسلک کی ترویج و اشاعت ہو گی۔ جب امام محمد بن حسن کو عہدۂ قضاء کی پیش کش ہوئی۔ تو امام ابو یوسف (م ۱۸۲ھ) نے امام محمد بن حسن کو عہدۂ قضاء قبول کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ امام محمدؒ نے عہدۂ قضاء کو قبول کر لیا۔

امام شمس الدین ذہبی (م ۷۴۸ھ) نے امام محمدؒ کے عہدۂ قضاء قبول کرنے پر اپنی تاریخ میں اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے۔ امام ذہبیؒ (م ۷۴۸ھ) فرماتے ہیں کہ:

”رقہ [2] میں خلیفہ ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ) کے سامنے قاضی کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا۔ اور اس سلسلہ میں امام ابو یوسفؒ (م ۱۸۲ھ) سے مشورہ کیا گیا۔ انہوں نے امام محمدؒ کے انتخاب کا مشورہ دیا۔ امام محمدؒ اس وقت کوفہ میں تھے۔ کوفہ سے بغداد بلائے گئے۔ اور پہلے امام ابو یوسفؒ (م ۱۸۲ھ) کے پاس گئے۔ اور ان سے اپنے انتخاب کی وجہ دریافت کی۔ اور امام ابو یوسفؒ نے ان سے پورا واقعہ بیان کر دیا۔ اور کہا کہ میں نے یہ مشورہ اس لیے دیا ہے کہ کوفہ اور بصرہ میں ہمارے مسلک کی بہت اشاعت ہو چکی ہے۔ اگر آپ شام چلے جائیں گے

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۲ ص ۱۷۳۔
[2] موسم گرما میں عباسی خلفاء کا دارالخلافہ ہوتا تھا (عراق)

تو وہاں بھی اس کی ترویج کا ذریعہ پیدا ہو گا۔ امام محمدؒ نے اس مصلحت کو اپنے انتخاب کے لیے پسند نہیں کیا۔ اور کہا کہ اس میں براہ راست مجھ سے گفتگو کرنی چاہیے تھی۔ اس گفتگو کے بعد امام ابویوسفؒ نے ان سے یحییٰ برمکی کے پاس چلنے کو کہا۔ دونوں صاحب یحییٰ کے پاس گئے۔ امام ابویوسفؒ نے یحییٰ سے کہا کہ محمد بن حسن سامنے موجود ہیں۔ ان سے عہدۂ قضاء کے لیے معاملات طے کر لیجیے۔ یحییٰ نے امام محمد پر ایسا دباؤ ڈالا کہ وہ عہدہ قضاء قبول کرنے کے لیے مجبور ہو گئے"۔[۱]

**امام ابویوسفؒ سے ناراضگی** امام محمد بن حسن نے عہدہ قضاء بادلِ ناخواستہ قبول کر لیا تھا۔ اور آپ یہ سمجھتے تھے کہ اس سلسلہ میں امام ابویوسفؒ (م ۱۸۲ھ) نے پیش رفت کی جس کی بنا پر مجھے مجبوراً عہدۂ قضاء قبول کرنا پڑا۔ اس لیے انہوں نے اس سلسلہ میں امام ابویوسفؒ (م ۱۸۲ھ) سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور اس ناراضگی نے اس قدر شدت اختیار کی کہ ان کے یہاں آمدورفت ترک کر دی۔ امام ابوبکر خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) نے یہاں تک لکھا ہے کہ امام ابویوسفؒ کے انتقال پر امام محمد بن حسن نے ان کے جنازہ میں شرکت تک نہیں کی۔[۲]

**امام محمد کی حق گوئی اور عہدۂ قضاء سے برطرفی** امام محمد نے عہدۂ قضاء بادل ناخواستہ قبول کر لیا تھا۔ اور اس میں ان کی خواہش کا ذرہ بھی دخل نہ تھا۔ اس لیے اس عہدہ پر جب تک فائز رہے بڑی دیانت داری اور بلاکسی رورعایت کے فرائض انجام دیتے رہے، اور آزادی و حق گوئی کا سررشتہ کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ ۱۷۵ھ میں یحییٰ علوی نے جب علمِ بغاوت بلند کیا۔ تو ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ) اس کا سروسامان دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا۔ اور دب کر صلح اختیار کی۔ معاہدہ قلمبند ہوا۔ اور یحییٰ کے اطمینان کے لیے

---

[۱] مناقب امام محمد ذہبی ص ۵۵، ۵۶۔
[۲] تاریخ بغداد ترجمہ امام محمد بن حسن۔

بڑے بڑے علما، فضلا، فقہاء اور محدثین نے اس پر دستخط کیے۔ یحییٰ اصلح پر راضی ہو کر بغداد آئے تو چند روز بعد ہارون الرشید نے نقضِ عہد کرنا چاہا۔ تمام علمائے کرام نے ہارون الرشید کے خلاف فتویٰ دے دیا کہ موجودہ صورت میں نقضِ عہد جائز ہے۔ لیکن امام محمد بن حسن نے اعلانیہ مخالفت کی اور فرمایا "نقضِ عہد جائز نہیں"۔ چنانچہ امام محمدؒ پر عتابِ شاہی نازل ہوا اور عہدۂ قضا سے برطرف کر دیے گئے۔ اور اس کے ساتھ انہیں فتویٰ دینے سے روک دیا گیا۔ اور ساتھ ہی قید و بند کی مصیبت بھی اٹھانی پڑی[1]

**رہائی اور عہدۂ قضا پر بحالی** امام محمد بن حسن جب قید میں تھے۔ ان دنوں ہارون الرشید (م ۱۹۳ھ) کی بیوی ام جعفر جائیداد وقف کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور اس سلسلہ میں امام محمدؒ سے فتویٰ طلب کیا۔ امام محمدؒ نے فرمایا کہ مجھے فتویٰ دینے سے روک دیا گیا ہے۔ اس لیے میں آپ کے مسئلہ پر کچھ نہیں بتا سکتا۔ ام جعفر نے اس سلسلہ میں ہارون الرشید سے گفتگو کی، انہوں نے امام محمد کو رہا کر دیا۔ اور اس کے ساتھ فتویٰ دینے کی اجازت بھی دے دی۔ اور دوبارہ ان کو عہدہ قضا پر بحال کر دیا۔ چنانچہ آپ اخیر تک عہدۂ قضا پر فائز رہے[2]

**وفات** ۱۸۹ھ میں ہارون الرشید رے گیا تو اپنے ساتھ امام محمدؒ اور مشہور امام نحو کسائی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں امام محمدؒ کا ۵۸ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ اور اسی دن یا دو دن بعد امام نحو کسائی کا بھی انتقال ہوا۔ ہارون الرشید کو ان دونوں ائمہ فن کے انتقال کا بہت صدمہ ہوا۔ اور نہایت افسوس کے ساتھ کہا کہ:

"میں نے فقہ اور نحو کو رے میں دفن کر دیا ہے"[3]

(باقی)

---

[1] بلوغ الامانی ص ۴۰

[2] ایضاً ص ۴۰

[3] جواہر المضیعہ جلد ۲ ص ۴۳

# مولانا چودھری محمد سرفراز احمد خاں (مرحوم)

جناب ڈاکٹر فیض احمد وڑائچ ۔ گجرات

(۲)

**عام عادات** آپ بہت صفائی پسند تھے ۔ بہتر سے بہتر چیز کو پسند کرتے ۔ لباس ہو تو صاف ستھرا ، کھانا پینا مختصر ۔ چائے کے عادی تھے ۔ اس معاملہ میں خاص بات یہ تھی کہ خواہ چائے میں کتنی بھی چینی پڑی ہوتی ، آپ چینی کے ایک دو چمچے اپنے ہاتھ سے مزید ڈالتے ۔ آپ کے سب دوست احباب اور اعزا واقارب آپ کی اس عادت سے واقف تھے ۔ چنانچہ وہ چائے کے ہمراہ فالتو چینی ضرور رکھتے ۔

نماز تہجد کے بچپن ہی سے پابند تھے ۔ سفر وحضر ہر حال میں اس کی ادائیگی کا اہتمام فرماتے ۔ یہ عادت ان کے دادا جان کی تربیت کا ثمرہ تھی ۔ جو آپ کو بروقت جگا دیا کرتے تھے ۔ اور اپنے ساتھ تہجد کی نماز پڑھوایا کرتے تھے ۔ تہجد کے نوافل سے فراغت کے بعد آپ کسی نہ کسی موسمی پھل کا ضرور استعمال کیا کرتے تھے ۔ اکثر سیب اور کینو وغیرہ پسند تھے ۔ گھر میں سے جو فرد بھی اس وقت آپ کے پاس ہوتا ، اسے بھی ان پھلوں میں شریک فرماتے ۔

کتابوں میں مختلف تفاسیر ، احادیث ، فقہ ائمہ اربعہ ، سیرت النبی ، حالاتِ صحابہ کرام و صحابیات زیر مطالعہ رہتیں ۔ آپ ایک لمحہ کے لیے فارغ نہیں رہ سکتے تھے ۔ سفر وغیرہ میں بھی ان ہی کی تمنا ہوتی کہ کوئی صاحبِ علم شخص مل جائے تو تبادلۂ خیالات ہوتا رہے ۔ اگر کسی عالمِ دین کا ساتھ ہو جاتا تو انتہائی خوشی ہوتی ۔ راستہ میں تبادلۂ خیالات

جاری رہتا خصوصاً اہم کتب کے متعلق پوچھتے رہتے۔ بعض دفعہ اسی گفتگو کے دوران میں اگر کوئی اچھی کتاب سامنے آجاتی تو اس کا سودا کر لیتے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میرے عقائد و خیالات کی اصلاح بزرگانِ سلف میں سے امام ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، اور پھر شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور انہی کے مکتبِ فکر کے دیگر بزرگان کی کتب کے مطالعہ سے ہوئی ہے۔ موجودہ قریبی دور کے علماء میں سے مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بہت مداح تھے۔ فرمایا کرتے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب سلفِ صالحین کے حقیقی جانشین ہیں۔ کیونکہ ان کا تمام تر فکر قرآن و سنت سے ماخوذ ہے اور ان کی خوبی یہ ہے کہ جس بات کو انہوں نے حق سمجھا، اس کو بغیر کسی جھجک کے سادہ اور دل نشین انداز میں بیان فرما دیا۔ بزرگانِ سلف کا بھی یہی طرزِ عمل تھا۔ اور آج ہم جو ان کے اقوال میں اختلاف دیکھتے ہیں تو اس کی وجہ بھی ان کا یہی طریق کار تھا۔

**وہابیت کا لیبل** آپ جب نوشہرہ چھاؤنی میں تھے تو ایک مرتبہ دو تین ماہ کی رخصت پر گھر تشریف لائے۔ یہاں گاؤں میں بعض مذہبی شخصیات سے تبادلۂ خیالات ہوا جن کے مسائل بس یہی تھے کہ نبی بشر ہوتا ہے یا نور؟ نبی عالم الغیب اور حاضر ناظر ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ بزرگوارم والد صاحب کے لیے یہ سب خیالات قرآن و سنت سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انہیں سمجھانے کی اپنی سی کوشش کرتے مگر بے سود۔ بس وہابی کا لیبل آپ پر چسپاں کر دیا گیا۔ یہیں سے آپ کے لیے مزید تحقیقات کرنے کا دروازہ کھلا۔ آپ نے اپنے عقائد بھی نوٹ کیے۔ اور ان کے عقائد بھی اور اندرون ملک اور بیرونِ ملک کے اکثر معتمد علماء حضرات اور اداروں سے اس معاملہ میں استفسار فرمایا۔ اس طرح سے تقریباً سو فتاویٰ موصول ہوئے۔

**یک صد فتاویٰ کا مجموعہ** ایک کتاب مائۃ فتاویٰ میں ان یک صد تحریروں کو جمع کر کے شائع کر دیا گیا۔ ان سب نے بزرگوارم والد صاحب کے عقائد کو قرآن و سنت کے مطابق قرار دیا۔ اور والد مرحوم سے بحث کرنے والے دوسرے بھائیوں کے عقائد

کو شرک اور گمراہی ۔ اس سے آپ کی بڑی ڈھارس بندھی اور بڑا اطمینان حاصل ہوا۔ آپ کی طبیعت پر ہر وہ بات جو قرآن و حدیث سے ہٹی ہوئی ہوتی، بہت گراں گذرتی۔ چنانچہ جوں جوں مطالعہ میں وسعت آئی، کئی قسم کی گمراہیاں آپ پہ آشکارا ہوئیں۔ آپ کو پریشانی اس بات پر ہوتی کہ یہ سب گمراہیاں اسلام کے نام پر پھیلائی جا رہی تھیں۔ چنانچہ جہاں بھی کسی شخص کو اسلام کے نام پر گمراہی پھیلاتے دیکھا اس پر گرفت فرمائی۔ اور پوری ہمدردی کے ساتھ اس کی اصلاح کی کوشش فرمائی۔

**بحث ختم نبوت**

ختم نبوت کے سلسلے میں جناب مرزا بشیر الدین محمود صاحب سے خط و کتابت رہی اور متعدد بار اس کی اصلاح کے لیے کوشش کی۔ اس خط و کتابت میں اصول تفسیر، اصول حدیث اور اصول فقہ کے حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ خط و کتابت مع تفسیر سورۂ صف ایک کتاب کی صورت میں بعنوان "مصداق بشارت احمد" شائع کر دی گئی۔

**حجیت حدیث**

جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کے خیالات کا پتہ چلا تو ان کے ساتھ بھی ضرورت حدیث اور حجیت حدیث کے موضوع پہ خط و کتابت ہوئی۔ اور دلائل و نظائر سے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش فرمائی کہ حدیث رسول ﷺ سے بے نیاز ہو کر کوئی شخص قرآن حکیم کو نہیں سمجھ سکتا۔ یہ طویل خط "مکتوب لطیف فی حجیت حدیث" نامی پمفلٹ میں شائع کر دیا گیا۔

جناب غلام جیلانی برق مرحوم کے ساتھ بھی ان کے خیالات کے متعلق خط و کتابت رہی۔ وہ بہت سٹ پٹائے اور ایک مرتبہ یہاں تک لکھ گئے کہ آپ کوشش تو فرما رہے ہیں، مگر محمد جیسے ابوجہل کو راہ راست پر نہیں لا سکتے۔ مگر بالآخر یہی وہ ایک ایسی باسعادت ہستی تھی کہ جنہوں نے اعتراف کیا کہ دیگر بزرگوں نے تو انہیں صرف گالیوں نوازا اور کفر و ضلالت کے فتوے لگائے مگر آپ نے صحیح طریق سے اصلاح کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک مرتبہ برادر بزرگ چوہدری مشتاق احمد صاحب کو کیمبل پور (اٹک) جانے کا اتفاق ہوا تو وہ جناب غلام جیلانی برق صاحب کی خدمت میں ملاقات کی غرض

سے حاضر ہوئے۔ جب انہوں نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ چودھری محمد سرفراز احمد خاں کے چھوٹے صاحبزادے ہیں تو برق صاحب اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے اور برادرِ عزیز کو گلے لگا لیا اور فرمایا کہ تمہارے والد بزرگوار کا میں شکرگزار ہوں کہ انہوں نے میرے خیالات کو صحیح رُخ پر موڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے[۱]۔ غرضیکہ جہاں کہیں بھی اسلام کے مُسلّم عقائد و نظریات پر کوئی ناروا حملہ ہوا، آپ نے فوراً اس کا دفاع کیا۔

یہاں گجرات ہی کے ایک ثقہ اہلِ حدیث عالم جناب حافظ عنایت اللہ اثری صاحب نے ایک کتاب بنام "عیونِ زمزم فی میلادِ عیسٰی ابن مریم" لکھی۔ اس میں انہوں نے مسلمانوں کے چودہ صد سالہ متفق علیہ عقیدے کے خلاف کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی تھی، معترضانہ بحث کی۔ اس کے جواب میں والد مکرم نے "معجزانہ ولادت عیسٰی بن مریم" نامی کتاب لکھی۔ اور خود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر مطالعہ کے لیے دی۔ ایک ہفتہ کے بعد پھر ان کی ملاقات کے لیے گئے تو حافظ صاحب اُٹھ کر اُن سے گلے ملے۔ اور کہا کہ آپ نے تو اپنی اس کتاب میں قرآن و سنت کی روشنی نمایاں کرنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ میں نے تو صرف ایک خیال کا اظہار کیا تھا۔ اس پر والد صاحب نے انہیں کہا کہ واہ حافظ صاحب آپ اس بات کو معمولی سمجھتے ہیں۔ ایسے مباحث سے سوائے ذہنی خلفشار کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بہرحال والد صاحب

---

[۱] مرحوم ڈاکٹر غلام جیلانی برق بڑے قابل آدمی تھے۔ ان کی کتاب دو قرآن کے زمانے میں میں نے کچھ نوٹ لکھے۔ اصلاح یافتگی کے بعد ان سے مختصر سی ملاقات اسلام آباد کے ہوٹل میں ہوئی۔ خط و کتابت مختصر سی رہی۔ کسی صاحب نے ان کے خطوط کے متعلق پوچھا تھا کہ اگر ملیں تو نقل چاہیے۔ میں نے ان کو جواب دیا کہ تلاش میں ناکامی ہوئی۔ اب وہ خط مل گئے ہیں۔ اگر وہ صاحب لکھیں تو فوٹو نقل بھجوا دوں۔ (مدیر)

آخر وقت تک انہیں ایک اچھا عالمِ دین خیال فرماتے رہے اور ان کے ساتھ دوستانہ مراسم بھی رہے۔

آپ کی تبلیغی سرگرمیوں کے نتیجہ میں کئی افراد کی اصلاح ہوئی۔ نوشہرہ میں ایک فوجی انگریز مسلمان ہوا۔ اس کے لیے والد مرحوم نے اسلام کی بنیادی تعلیمات پر مبنی ایک کتابچہ انگریزی زبان میں لکھا جس کا نام CONCEPTION OF ISLAM رکھا۔ مذہب اسلام قبول کرنے کی وجہ سے انگریزوں نے اسے فوج سے نکال دیا اور واپس انگلستان بھیج دیا۔ (دیکھا سائنس پرستوں کا تعصب! مدیر) ۔ اسی طرح سے اپنے عزیزوں میں سے ایک ایم اے پاس لڑکی جو اپنی ایک روسی سہیلی کے دہریہ خیالات سے متاثر تھی اور خدا کی ہستی کی منکر تھی یا کم از کم خدا کی ہستی کے بارے میں متشکک تھی، اُسے ایک خط کے ذریعے خدا کی ہستی کا تصور دلایا۔ چنانچہ وہ مطمئن ہو گئی اور شکریہ کا خط لکھا۔ یہ خط و کتابت مع چند اضافوں کے آپ کے پمفلٹ "ہستی باری تعالیٰ" نامی کتاب میں شائع ہو گئی ہے۔ فیصل آباد میں آپ چند ماہ ایک قادیانی خاندان کے ہاں رہے۔ اس دوران میں انہیں قرآن حکیم کی تعلیم دیتے رہے اور بالآخر دوبارہ انہیں اسلام کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ اسی طرح آپ کے گاؤں کے کئی افراد جو قادیانیت اختیار کر چکے تھے، آپ کی دعوت کی بدولت وہ سب قادیانیت سے تائب ہو کر از سرِ نو مسلمان ہو گئے۔ صرف ایک صاحب جو برادری میں بہت قریب ہیں اور جن کے لیے آپ نے بہت کوشش کی، انہیں قادیانیت سے توبہ کرنے کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ اُن کی وجہ سے ان کا سارا خاندان ابھی تک ضد میں مبتلا ہے۔ آخری ایام میں جب آپ اپنی بیماری کے سبب ہسپتال میں زیرِ علاج تھے، ان کا چھوٹا بھائی بیمار پرسی کے لیے حاضر ہوا تو بڑی دلسوزی کے ساتھ اسے فرمایا کہ کاش تمہارے بڑے بھائی کی اصلاح ہو سکتی۔ اور مجھے انتہائی خوشی ہوتی کہ آپ جہنم کی آگ سے بچ جاتے۔ دُعا بھی فرماتی۔

غرضیکہ بزرگوارم والد صاحب کی انتہائی کوشش و خواہش یہی ہوتی کہ کوئی بھی انسان گمراہیوں سے بچ جائے۔ آخری دور میں سیرت پر انگریزی زبان میں ایک کتاب

(THE WORLD OF PROPHET) کے نام سے لکھی۔ اس کی اشاعت کے لیے بھی ہمیں وصیت فرمائی۔ چنانچہ اس کی اشاعت کا کام ہو رہا ہے۔

آپ کا مسلک یہی تھا کہ بنیادی چیز صرف قرآن و سنّت ہے اور انہی کی پیروی میں مسلمانوں کی نجات و فلاح ہے۔ بزرگانِ سلف و خلف کے جو اقوال، ارشادات اور اعمال قرآن و سنّت کے مطابق ہوں۔ وہ قابلِ ستائش اور قابلِ اتباع ہیں۔ اور جو ان کے خلاف ہیں ان کو نظر انداز کر دینا چاہیے، اُن کے متعلق آپ سے کوئی پرسش نہ ہوگی کسی کے متعلق اپنے سینہ میں کینہ، بغض و عناد نہیں رکھنا چاہیے۔ آپ کے اس طرزِ عمل سے آپ کے سب اعزا و اقربا اور احباب آپ کے ساتھ احترام کا معاملہ کرتے تھے۔ مرحوم کا مسلک یہ تھا کہ جو اصحاب زندہ ہیں انہیں ان کے غلط نظریات سے آگاہ کرنا چاہیے اور ان کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

آپ کی تالیفات کی فہرست اور ان پر مختلف افراد کے تبصرہ جات منسلک ہیں۔ آپ کا طریقۂ کار مفت تقسیم کا تھا۔ صرف ڈاک کا خرچہ ٹکٹوں کی صورت میں منگوا لیتے تھے اور اگر کسی نے زائد ٹکٹ دیئے ہوئے تو وہ بھی اُن کو کتب کے ساتھ واپس بھجوا دیتے۔ وفات سے چند ماہ قبل آپ نے اپنے کتب خانہ کی سب کتب تقسیم فرما دی تھیں۔ چند کتابیں اپنے بچوں اور احباب کو دے دیں۔ اور اکثر کتب کو مدرسہ احیاء العلوم کیھالہ تحصیل و ضلع گجرات کے نام وقف فرما دیا۔ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۸۶ء کو سب کتابیں وہاں کے ناظم جناب مولانا محمد نصر اللہ خان صاحب (مرحوم)، کے حوالے کر دیں۔

جنوری ۱۹۸۷ء میں چند روز ہسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد ۱۴ جنوری کو تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں صبح صادق کے قریب آپ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔

## رسائل و مسائل

# بحری جانور اور خرگوش کی حلت و حرمت

**سوال:** جناب شمس پیرزادہ صاحب مترجم کتاب "اسلام میں حلال و حرام" نے اپنی کتاب کے صفحہ نمبر ۶۹ پر لکھا ہے کہ "بحری جانور جو پانی میں رہتے ہیں اور پانی میں رہ سکتے ہیں، سب حلال ہیں۔ جس حالت میں بھی پائے جائیں، خواہ پانی سے زندہ نکالے گئے ہوں یا مردہ سطح آب پر تیرتے ہوئے پائے جائیں یا اس کے بغیر، مچھلی ہو یا سمندری کتا، سمندری خنزیر ہو یا کوئی اور جانور، یکساں طور پر جائز ہیں ۔۔ الخ"

اِس پر دو قرآنی آیات کا استدلال ہے۔

ہمارے فقہ اور توراۃ میں بری، بحری اور فضائی تمام جانداروں کی فہرست حلال و حرام موجود ہے جس میں کتا اور خنزیر حرام ہے۔ (بوجوہ مرقومہ)

فقہ فرقہ امامیہ اثنا عشریہ میں خرگوش اور کھال والی مچھلی حرام ہے۔ تورات میں بھی یہ جاندار حرام ہیں جب کہ ہم سواد اعظم دونوں کو حلال شمار کرتے ہیں۔

ازراہِ مہربانی اس مسئلہ کی وضاحت کریں کہ پانی کے جانور بشمول کتا و خنزیر بحری اور خرگوش (بری) کیونکر حلال شمار ہوں گے؟

**جواب:-**

میں نے جناب پیرزادہ صاحب کا ترجمہ کردہ مضمون اور پھر ڈاکٹر یوسف القرضاوی صاحب کی اصل کتاب کا متعلقہ حصہ پڑھا ہے۔ قرضاوی صاحب سمندری جانوروں

کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"کلھا حلال، السمک والحیتان وما یسمی کلب البحر، خنزیر البحر او غیر ذالک"۔

(سمندری جانور سب حلال ہیں، خواہ وہ مچھلیاں ہوں، یا وہ جانور ہوں جنھیں سمندری کتا یا سمندری خنزیر کے نام سے پکارا جاتا ہے یا کوئی دوسرا سمندری جانور ہو)

شمس پیرزادہ صاحب نے ترجمہ یوں کیا ہے:

"مچھلی ہو یا سمندری کتا، سمندری خنزیر ہو یا کوئی اور جانور یکساں طور پر جائز ہیں"۔

بعض فقہاء کا قول اگرچہ یہ ہے کہ ہر بحری جانور حلال ہے، لیکن فقہائے حنفیہ پانی میں رہنے والے جانوروں میں سے صرف مچھلی یا مچھلی سے ملتے جلتے جانور کو حلال قرار دیتے ہیں۔ احناف اپنے مسلک کے حق میں متعدد آیاتِ قرآنی سے استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً:

— یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ

(البقرہ - ۱۷۲)

— اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ (المائدہ - ۴)

— وَیُحِلُّ لَھُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْھِمُ الْخَبٰٓئِثَ

(الاعراف - ۱۵۷)

طیبات کے زمرے میں وہی جانور آسکتے ہیں جن کو صراحت کے ساتھ قرآن و حدیث میں پاکیزہ قرار دیا گیا ہو یا جن کے کھانے کا ثبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام سے ملتا ہو۔ اس لیے حنفی فقہاء نے کیکڑے، مینڈک، مگرمچھ، گھڑیال کو حرام قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر قرضاوی کے لیے مناسب یہ تھا کہ وہ اس مسئلے میں فقہاء کے اختلاف کا ذکر کر دیتے۔ کتے اور خنزیر کی حرمت صریح و شدید اور کتاب و سنت سے قطعی طور

پر ثابت ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کوئی جانور آبی ایسا پایا جاتا ہے جسے کُتے یا خنزیر کا نام دیا جا سکتا ہو، تو بحری کُتے اور بحری خنزیر کا ذکر کرنا اور اُن کے حلال ہونے کی صراحت کرنا آخر کون سی ضرورت تھی؟

پھر جناب قرضاوی صاحب کی کتاب کا ترجمہ کرتے وقت مترجم کو چاہیے تھا کہ وہ اس مقام پر حاشیہ کی شکل میں یہ وضاحت کر دیتے کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے اور ہندو پاکستان کی مسلم اکثریت کا مسلک بھی بیان کر دیا جاتا۔ موجودہ ترجمے کی عبارت بڑی غلط فہمی و وحشت پیدا کر رہی ہے۔

خرگوش (ارنب) کی حلت پر اہلِ سنت کا اجماع ہے۔ صحیح مسلم، کتاب الصید، میں صحیح حدیث موجود ہے کہ صحابہ کرام نے خرگوش کا شکار کر کے اسے ذبح کیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوشت کا حصہ پیش کیا جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمایا۔ اس طرح کی دیگر احادیث بھی کتب صحاح میں وارد ہیں جو خرگوش کے حلال ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

اسی موضوع پر "رسائل و مسائل حصہ ششم" میں ایک سوال کا جواب میرے قلم سے چھپا ہے، جس کا عنوان ہے "جانوروں کی حلت و حرمت"۔ چاہیں تو اس کا بھی مطالعہ کر سکتے ہیں۔

(ملک غلام علی)

---

**ضروری تصحیح (شمارہ ماہ مئی ۱۹۹۱ء)**

اشارات کے زیرِ عنوان ص ۹ پر سورۃ ابراہیمؑ کی آیت نمبر ۲۴ کا ایک لفظ طباعت سے رہ گیا ہے ـــ کَشَجَرَةٍ کے بعد طَيِّبَةٍ پڑھیں۔

(ادارہ)

# مطبوعات

**حافظ لدھیانوی کے نعتیہ مجموعے** | از جناب حافظ لدھیانوی - ناشر: بیت الادب راجہ روڈ، گلستان کالونی، فیصل آباد۔

محترم حافظ لدھیانوی اردو کے نعت گو شعرا میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ فنی محاسن کے علاوہ اُن کی نعتوں کی ایک اور بہت نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ ثنائے رسولؐ کرتے ہوئے حدودِ شریعت کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔

تازہ تین مجموعے پیشِ نظر ہیں:

۱۔ یا صاحب الجمال (۲) صلِ علی النبی (۳) سلام بحضور خیر الانام۔

یہ نہایت اہتمام سے شائع کیے گئے ہیں۔ سفید دبیز کاغذ لگایا گیا ہے۔ اور کتابت و طباعت کا اہتمام قابلِ داد ہے۔ پہلی دونوں کتابیں مجلد اور بہت خوشنما گرد پوش سے آراستہ ہیں۔ دونوں کی قیمت پچاس پچاس روپے ہے۔ تیسری کتاب غیر مجلد ہے اور یہ مفت طلب کی جاسکتی ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و عقیدت رکھنے والے حضرات یہ مجموعے ضرور حاصل کریں۔

حافظ صاحب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اندازِ سخن دیکھیے محبوبِ خدا کے — ہر اشک ہے قیمت میں فزوں لعل و گہر سے

---

دے کے اشعار کو آہنگِ غزل — طرحِ نو نعت میں ڈالی ہم نے

---

رُخِ زیبا سے ہے زیبائی عالم کو فروغ — تجھ سے ہے رنگِ چمن حسنِ بہاراں تجھ سے

---

سلام اُس پر لقبِ خیرالامم جس سے ملا ہم کو — یقیں کا نُور، ایماں کا عَلَم جس سے ملا ہم کو

---

حافظ صاحب محترم نے اس کتابچے میں ترجمے کے ساتھ گیارہ ایسی احادیث اکٹھی کر دی ہیں جو برکات حاصل کرنے اور مشکلات سے رہائی پانے کے لیے بطور دُعا پڑھی جاتی ہیں۔ یہ کتابچہ بھی بہت خوشنما ہے اور ثواب حاصل کرنے کی نیت سے شائع کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا پتہ سے طلب کیجیے۔

(ظفر زیدی)

---

**ماہنامہ کتاب نما (دہلی)** | ایڈیٹر: شاہد علی خاں ۔ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ بھارت ۔ قیمت فی پرچہ پانچ روپے۔ سالانہ چندہ ۴۵/ روپے

حصولِ آزادی کے بعد بھارت میں اُردو زبان پر جو افتاد پڑی، وہ اپنی جگہ۔ متعصب ہندو قیادت نے اس زبان کو مٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ جو اس ملک کی عظمت کا ایک نشان ہے، لیکن اس حکومتی رویے کے باوجود بھارت میں اُردو کا عَلَم سرنگوں نہ ہوا۔ اہلِ ہمت نے جن میں ایک بڑی تعداد ہندوؤں کی بھی ہے، اس زبان کی بقا اور ترقی کے لیے نہایت مفید خدمات انجام دیں اور دے رہے ہیں۔

ماہنامہ کتاب نما دہلی اس کا ایک ثبوت ہے۔ ہم دُعا کرتے ہیں خدا کرے کہ اُردو کی اس شمع درخشاں کو روشن رکھنے میں کامیاب رہیں۔

(ظفر زیدی)

---

# روحِ افکارِ مودودی

جسٹس میجر (ریٹائرڈ) **غلام محی الدین اعوان** نے

مولانا سید **ابوالاعلیٰ مودودی** کی "تفہیم القرآن" میں سے انھیں کے الفاظ میں مرتب کیا ہے۔

| | صفحات | قیمت |
|---|---|---|
| دنیا کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں | ۱۹۰ | -/۲۷ روپے |
| آخرت کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں | ۳۸۰ | -/۵۱ 〃 |
| انسان کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں | ۴۹۰ | -/۶۶ 〃 |
| شیطان کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں | ۹۸ | -/۱۵ 〃 |
| تقدیر و مشیت کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں | ۵۰ | ۷/۵۰ 〃 |
| توبہ و استغفار کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں | ۹۰ | -/۱۲ 〃 |
| اہلِ جنت کے لیے انعامات و اکرامات کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں | ۱۱۴ | ۱۶/۵۰ 〃 |

زیرِ طبع:

- انڈیکس تفہیم القرآن

زیرِ ترتیب:

- توحید و شرک کی حقیقت، قرآن کی روشنی میں
- اہلِ دوزخ کے مصائب و تعذیبات، قرآن کی روشنی میں

- سائز: ۲۳ × ۱۸ / ۸
- کاغذ: فلائنگ
- طباعت: عکسی
- ٹائیٹل: دیدہ زیب


ادارہ

ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE

جاری کردہ: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

# ماہنامہ ترجمان القرآن

**رُوداد اجتماعِ عام**

- افتتاحی خطاب
- کلیدی خطاب
- خطاب جلسہ عام
- اختتامی خطاب

**قاضی حسین احمد** امیر جماعت اسلامی

- رپورٹ جماعتِ اسلامی پاکستان، ۸۳-۸۹ء (قافلہ حق کی چھ سالہ رودادِ سفر)
- اعلامیہ

## اجتماعِ عام نمبر ۸۹ء

## دیگر تقاریر

- دروس قرآن و حدیث
- انقلابی کردار: ایمان، جہاد اور دعوت
- انقلابی جماعت: رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ
- پاکستان میں جماعتِ اسلامی کا کردار
- اسلامی انقلاب میں خواتین کا کردار
- نوجوان — اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ
- ہم اس ملک میں کیا معاشی تبدیلیاں لائیں گے؟
- بین الاقوامی مندوبین

## مُقرّرین

- میاں طفیل محمد
- چوہدری رحمت الٰہی
- نعیم صدیقی
- مولانا فتح محمد
- سید منور حسن
- مولانا جان محمد عباسی
- پروفیسر خورشید احمد
- مولانا خلیل احمد حامدی
- حافظ محمد ادریس
- ایوب ٹھاکر
- پروفیسر غفور احمد
- خرم مراد
- مولانا گوہر رحمٰن
- لیاقت بلوچ
- ڈاکٹر صیام

- ٹائٹل، دیدہ زیب
- کتابت، کمپیوٹرائزڈ
- ضخامت، ۲۶۴ صفحات
- قیمت، -/۳۰ روپے
- لائبریری ایڈیشن، -/۴۵ روپے


ادارہ ترجمان القرآن پرائیویٹ لمیٹڈ اُردو بازار، لاہور
فون: ۶۸۶۳۶-۳۲۴۴۶۸ پوسٹ بکس ۱۴۴۳